BROWN
BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222126
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

(جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں)

پردۂ مجاز

حصہ دوم

از

عدیم المثال فسانہ نگار منشی پریم چند جی

مصنف

خواب و خیال۔ رام چرچا۔ نرملا۔ بازارِ حسن وغیرہ

پبلشرز

لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

بار اول　　　قیمت [illegible]　　　[illegible]

پردۂ مجاز

حصّہ دوم

(۲۶)

آگرے کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر دونوں فرقوں کے شوریدہ سر جمع ہو جاتے اور دو چار جانیں تلف ہو جاتیں۔ کہیں کسی بنئے نے ڈنڈی ماری اور مسلمانوں نے اس کی دوکان پر دھاوا کر دیا۔ کہیں کسی جلاہے نے کسی ہندو کا گھڑا چھو لیا اور محلے میں فوجداری ہو گئی۔ ایک محلے میں موہن نے رحیم کا کنکوا لوٹ لیا اور اسی بات پر کئی ہندوؤں کے گھر لُٹ گئے۔ دوسرے محلے میں دو کتوں کی لڑائی پر کئی آدمی زخمی ہوئے۔ کیونکہ ایک موہن کا تھا۔ دوسرا سعید کا۔ ذاتی عداوتیں فرقہ وارانہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ صبح کو خواجہ صاحب حاکم ضلع کو سلام کرنے جاتے، شام کو بابو جشودا نندن۔ دونوں اپنی اپنی اطاعت شعاری کا راگ الاپتے۔ دیوتاؤں کے بھاگ جاگ گئے۔ جہاں سنتوں کی مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں؛ وہاں پجاریوں کی بھنگ گھٹنے لگی۔ مسجدوں کے دن پھرے۔ جہاں سانڈ جگالی کرتا تھا۔ وہاں

پیر صاحب کی ہانڈیاں چڑھیں۔ ہندوؤں نے مہابیر دل بنایا اور مسلمانوں نے علی غول سجایا۔ ہولی کے دن تھے۔ گلیوں میں گلال کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اتنے جوش سے کبھی ہولی نہ منائی گئی تھی۔ وہ نئی روشنی کے ہندو جو رنگ کو خونِ ناحق سمجھتے تھے: "آج جیتے جاگتے" اندر دھنش بنے ہوئے تھے۔ اتفاق سے ایک میاں صاحب کے کپڑوں پر دو چار چھینٹے پڑ گئے۔ بس آفت ہی تو آ گئی۔ سیدھے جامع مسجد میں پہونچے اور مینار پر چڑھکر بانگ دی۔ "اے اُمت رسول! آج ایک کافر کے ہاتھوں میرے دین کا خون ہوا ہے۔ یا تو کافروں سے اِس خون کا انتقام لو۔ یا میں مینار سے گر کر نبی کی خدمت میں فریاد کرنے جاؤں"

مسلمانوں نے یہ بانگ سُنی اور انکی تیوریاں بدل گئیں۔ شام ہوتے ہوتے دس ہزار آدمی سروں سے کفن بیٹے جامع مسجد کے سامنے آکر جمع ہو گئے۔ سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ ہولی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ پچکاریاں چھوڑ لوگوں نے لاٹھیاں سنبھالیں۔

بابو جشودانندن کبھی اِس افسر کے پاس جاتے کبھی اُس افسر کے پاس چاروں طرف مسلم زعیموں کے نام تار بھیجے۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اور بالآخر جب وہ مایوس ہوکر اُٹھے تو لشکرِ اسلام کا دھاوا ہو چکا تھا۔ پہلا وار جشودانندن پر ہوا۔ بابو صاحب نے پستول نکال لیا۔ لیکن چھوڑنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک اسلامی تلوار نے شہید کر دیا۔

اِس سانحہ کی خبر پاتے ہی مہابیر دل کے جوانوں کا خون اُبل پڑا۔ دو سو آدمی تلواریں لے کر نکل پڑے۔ ہندو محلوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں جو کچھ ہو رہا تھا وہی مسلمان محلوں میں ہندو کرنے لگے۔ اہنسا نے ہنسا کے آگے سر جھکا دیا۔ نہیں ہنسکر بھاگے اور چھرے چلاتے جاتے تھے۔ مناسب تو

یہ تھا کہ طرفین کے جو دھا آمنے سامنے کھڑے ہوجاتے اور خوب دل کے ارمان نکال لیتے لیکن مردوں کی جوانمردی اور نامردوں کی جوانمردی میں بڑا فرق ہے۔

دفعتہً خبر اڑی کہ بابو جشودا نندن کے گھر آگ لگا دی گئی۔ دو ڈھائی ہزار ہندوؤں کی جماعت ڈبل مارچ کرتی ہوئی اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے اس طرف چلی۔ منٹوں کی راہ پلوں میں طے ہوئی۔ دور ہی سے شعلے آسمان سے باتیں کرتے نظر آئے۔ رفتار اور بھی تیز کی۔ اور ایک لمحہ میں موقع پر جا پہونچے۔ دیکھا تو یہاں کسی مسلمان کا پتہ نہ تھا۔ آگ پُشت کی جانب لگی ہوئی تھی۔ باگیشوری ایک کوٹھری میں دروازہ بند کئے بیٹھی تھی۔ ان لوگوں کی آواز سُنتے ہی وہ باہر نکل آئی اور بولی۔ ہائے میری اہلیا! ارے دوڑو، اُسے ڈھونڈو، پاپیوں نے نہ جانے اس کی کیا دُرگتی کی۔ ہائے میری بچی!

ایک نوجوان نے پوچھا۔ کیا اہلیا کو اٹھالے گئے؟

باگیشوری۔ ہاں بیٹا! اٹھا لے گئے۔ منع کر رہی تھی کہ اندر ہی! باہر نہ نکل مرینگے تو ساتھ ہی مریں گے۔ لیکن نہ مانی۔ جیوں ہی بدمعاشوں نے گھر میں قدم رکھا آنگن میں آکر ان سے بحث کرنے لگی۔ ہائے اس کی باتیں کبھی نہ بھولیں گی کس کس کو روؤں ہمیشہ سمجھاتی رہتی کہ ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ نہ مسلمانوں کے لئے دُنیا میں کہیں ٹھور ٹھکانا ہے۔ نہ ہندوؤں کے لئے۔ دونوں اسی دیس میں رہیں گے۔ اور اسی دیس میں مریں گے۔ پھر آپس میں کیوں لڑتے مرتے ہو۔ مگر میری کون سُنتا ہے عورتیں تو پاگل ہوتی ہیں۔ بھونکا کرتی ہیں۔ چلنے دو تم گھر لے کر کیا کرنا ہے۔ تم جاکر میری بچی کو تلاش کرو۔ جاکر خواجہ محمود سے کہو کہ اس کا پتہ لگا دیں ہائے! ایک دن وہ تھا۔ کہ دونوں آدمیوں میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ آج یہ حال ہے! کتنا انہیں شرم نہیں آتی ہا جس لڑکی کو بیٹی بناکر میری گود میں سونپا تھا۔ آج اُسی کی

آبرو مٹانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ہم سے اب ان کی کیا دشمنی۔ جس سے دشمنی تھی۔ وہ تو رُخصت ہو گیا۔

اندر باگیشوری یوں گریہ وزاری کر رہی تھی۔ اُدھر لوگ آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ مگر پانی کے چھینٹے اُس پر تیل کا کام کرتے تھے۔ بارے فائر بریگیڈ موقع پر آ پہونچا اور شعلے کسی طرح فرو ہوئے۔

اُدھر لوگ خواجہ صاحب کے پاس پہونچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دروازے پر جستو داس کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ اور خواجہ صاحب بیٹھے رو رہے ہیں۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بولے۔ تم سمجھتے ہو گے یہ میرا دشمن تھا۔ خدا جانتا ہے مجھے اپنا بھائی یا بیٹا بھی اس سے زیادہ عزیز نہ تھا۔ اگر مجھ پر کسی قاتل کا ہاتھ اٹھتا۔ تو جستو دا اُس وار کو اپنی گردن پر لیتا۔ پھر بھی ہم دونوں کی زندگی کے آخری سال میدان آرائیوں میں گذرے اور آج اسکا یہ انجام ہوا۔ خدا جانتا ہے میں نے ہمیشہ اتحاد کی کوشش کی۔ اب بھی میرا یہی ایمان ہے کہ اتحاد ہی سے اِس بدنصیب قوم کی نجات ہوگی۔ لیکن خدا جانے وہ کون سی طاقت تھی جو ہم دونوں کو برسرِ پرخاش رکھتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھے۔ ایک ہی اسکول میں تعلیم پائی۔ ایک ہی میدان میں کھیلے۔ پر کون جانتا تھا کہ اس دوستی کا یہ انجام ہوگا۔ آؤ اس لاش کو اٹھاؤ۔ میرے کندھا دینے میں کوئی ہرج تو نہیں ہے؟ اتنی رعایت تو میرے ساتھ کرنی ہی پڑے گی۔

ایک آدمی نے کہا۔ الپیا کو بھی لوگ اٹھا لے گئے۔

خواجہ۔ الپیا کو اٹھا لے گئے۔ اب مجھے خبر نہیں! کلام مجید کی قسم جب تک الپیا کو ڈھونڈھ نہ نکالوں گا۔ مجھے دانہ پانی حرام ہے۔ تم لوگ لاش لے جاؤ۔ میں الپیا کی تلاش میں جاتا ہوں۔ سارے شہر کی خاک چھان ڈالوں گا۔ ایک

ایک گھر میں جا کر دیکھوں گا۔ اگر کسی بے دین نے قتل نہیں کر ڈالا ہے۔ تو اُسے ضرور کھوج نکالوں گا۔ میں نے اُسے میلے میں پایا تھا۔ کیسی بھولی بھولی پیاری پیاری بچی تھی۔ بھابی سے میری طرف سے عرض کر دینا۔ مجھ سے ملال نہ رکھیں جب تک خواجہ زندہ ہے۔ اُنہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ کہدینا محمود یا تو املیا کو ان سے ہم آغوش کرے گا۔ یا مُنہ میں کالکھ لگا کر ڈوب مرے گا۔

یہ کہہ کر خواجہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے، لکڑی اٹھائی اور باہر۔

(۲۷)

چکردھر نے اُس دن لوٹتے ہی منشی جی سے آگرہ جانے کی اجازت مانگی۔ منورما نے انکے سینے میں وہ شعلہ پیدا کر دیا تھا۔ جو املیا ہی کے چشمۂ الفت میں بجھ سکتا تھا۔ یوں وہ زندگی بھر منورما سے غیر متاثر رہ سکتے تھے۔ لیکن منورما نے پُرانی یادوں کو تازہ کر کے انکے دل میں اشتیاق۔ اضطراب اور تمنا کو بیدار کر دیا تھا۔ اسلئے اب وہ نفس کو ایسی مضبوط رسی سے باندھنا چاہتے تھے کہ وہ جنبش بھی نہ کر سکے۔ وہ املیا کے دامنِ محبت میں پناہ لینا چاہتے تھے۔

منشی جی نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا۔ یوں تمہاری خواہش سیر کرنے کی ہو تو جاؤ۔ لیکن تمہیں وعدہ کرنا پڑے گا۔ کہ منشی جشودا نندن سے نہ ملوگے۔

چکردھر۔ اُن سے ملنے ہی تو جا رہا ہوں۔

بجردھر۔ میں کہے دیتا ہوں اگر تم اُدھر گئے تو بُرا ہوگا! تمہارے لئے بھی اور میرے لئے بھی۔

چکردھر خاموش ہو گئے۔ آتے ہی آتے ماں باپ کو کیسے ناراض کر دیتے لیکن ہولی کے تیسرے دِن بعد جب اُنہوں نے آگرے کے جلسے!

جشودا نندن کے قتل اور اہلیا کی بے حرمتی کی خبر سُنی تو وہ ایک اضطراب کی حالت میں آکر منشی جی سے بولے۔ اب میرا وہاں جانا لازمی ہے۔

منشی جی نے نرملا کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ابھی جیل سے طبیعت آسودہ نہیں ہوئی کہ دوبارہ جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ وہاں اس وقت بدامنی مچی ہوئی ہے۔ ناکردہ گناہ پھنس جاؤ گے۔ اور پھر جا کر کرو گے ہی کیا؟ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

چکردھر۔ کم سے کم اہلیا کا پتہ تو لگا لوں گا۔

بجردھر۔ بالکل فضول۔ پہلے تو اس کا پتہ لگنا ہی مشکل اور لگ بھی گیا تو تمہارا اس سے کیا تعلق؟

نرملا۔ لڑکی کو اپنی عزت آبرو کا کچھ خیال ہوگا۔ تو وہ اب تک زندہ ہی نہ ہوگی۔ اگر زندہ ہے تو سمجھ لو بھرشٹ ہو گئی۔

چکردھر۔ اماں! کبھی کبھی آپ ایسی باتیں کہہ دیتی ہیں کہ ہنسی آتی ہے۔ جان کے خوف سے تو بڑے بڑے جوالمرد زمین پر سجدہ کرتے ہیں۔ اہلیا کی ہستی ہی کیا۔ بھرشٹ وہ ہوتا ہے جو گمراہ ہو کر کوئی کام کرے۔ جو کام ہم جبراً کرتے ہیں۔ وہ بھرشٹ نہیں کر سکتا۔

بجردھر۔ تمہارا مطلب میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن تم اُسے چاہے عصمت کی دیوی سمجھو۔ ہم تو اُسے بھرشٹ ہی سمجھیں گے۔ ایسی بہو کے لئے ہمارے گھر میں جگہ نہیں ہے۔

چکردھر نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ وہ آپ کے گھر میں نہ آئیں گی۔

بجردھر نے بھی اتنی ہی بے مروتی سے کہا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ بیٹے کی محبت سے لاچار ہو کر میں اُسے قبول کر لوں گا۔ تو یہ تمہاری غلطی ہے۔ اہلیا

میرے گھر کی دیوی نہیں ہو سکتی۔ چاہے اس کے لیے مجھے بیٹے کی جدائی ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ میں بھی ضدی ہوں۔

چکر دھر تیکھے پھرے ہی تھے کہ نرملا نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور بادرانہ فہمایش کے انداز سے بولی۔ بچہ۔ تم سے ہمیں ایسی امید نہ تھی۔ اب ہمارا کہنا مانو خاندان میں داغ نہ لگاؤ۔

چکر دھر نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ میں نے آپ کی مرضی کو ہمیشہ مقدم سمجھا لیکن اس معاملے میں مجبور ہوں۔

بجر دھر نے بے رخی کے ساتھ کہا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم آپ سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔

چکر دھر۔ اگر آپ کو یہی منظور ہے تو میرا کیا اختیار۔

بجر دھر۔ یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟

چکر دھر۔ جی ہاں آخری۔!

چکر دھر کے چلے جانے کے بعد نرملا نے کہا۔ للو کبھی ایسا کام نہ کرے گا جس سے خاندان کی رسوائی ہو۔ تم نے اُسے ناحق چڑھا دیا۔

بجر دھر۔ بیٹے کا پیار کھینچ رہا ہو تو جا کر اُسی کے ساتھ رہنا۔

نرملا۔ تم تو جیسے میان سے تلوار نکالے بیٹھے ہو۔ للو اگر بے دل ہو کر کہیں چلا جائے تو۔

بجر دھر۔ تو میرا کیا نقصان؟ ایسا لڑکا مر بھی جائے تو مجھے رنج نہ ہو۔

نرملا۔ اچھا بس اب منہ بند کرو۔ بڑے دھرماتما بن کر آئے ہو۔ رشوتیں لے لے کر ہضم کرتے ہو تو دھرم نہیں جاتا۔ شرابیں اڑاتے ہو تو منہ میں کالکھ نہیں لگتی؟ جھوٹ کے پہاڑ کھڑے کرتے ہو تو آبرو نہیں جاتی۔ لڑکا ایک بیکس

کی حفاظت کرنے جاتا ہے تو ناک کٹتی ہے؟ تم نے کون کونسے بڑے کام نہیں کئے۔ آج دیوتا بننے چلے ہو۔

منشی جی نے نرملا کے منہ سے اتنی دلآزار باتیں پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔ وہ جو عزت اور عصمت کی مورت تھی۔ آج شمشیر برہنہ بنی ہوئی تھی۔ ڈانٹ کر بولے سنو جی۔ میں ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔ باتیں تو نہیں سنیں میں نے اپنے افسروں کی۔ جو میری قسمت کے مالک تھے تم کس کھیت کی مولی ہو زبان تالو سے کھینچ لوں گا۔ سمجھ گئیں؟

یہ کہہ کر منشی جی باہر چلے گئے اور ستار پر ایک گیت چھیڑ دی۔

چکردھر گھر سے پہونچے تو سویرا ہو گیا تھا آفتاب ایک قطرہ اشک کی طرح افق کی سرخ آنکھوں میں کانپ رہا تھا۔ چکردھر کا دل طرح طرح کے دلشکن خیالات کا آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ ایک لمحہ تک وہ کھڑے سوچتے رہے۔ کہاں جاؤں جشودانندن کے گھر جانا بیکار تھا۔ آخر انہوں نے خواجہ صاحب کے گھر چلنے کا فیصلہ کیا۔ خواجہ صاحب پر اب بھی بے حد اعتماد تھا راستے میں فوجی سپاہی گشت لگاتے ہوئے نظر آئے۔ دوکانیں سب بند تھیں شہر میں ماتم چھایا ہوا تھا۔

خواجہ صاحب کے دروازے پر پہونچے تو دیکھا۔ ہزاروں آدمی ایک لاش کے گرد کھڑے ہیں۔ اور اسے قبرستان لے جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ چکردھر کو اندیشہ ہوا کہیں خواجہ صاحب تو نہیں قتل کر دیئے گئے۔ کسی سے پوچھنا ہی چاہتے تھے۔ کہ دفعتاً خواجہ صاحب نے آکر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بولے۔ خوب آئے بیٹا۔ تمہیں آنکھیں ڈھونڈھ رہی تھیں۔ ابھی ابھی تمہارا ہی ذکر تھا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ جانتے ہو

(حاشیہ: بے جستجو)

یہ کیسی کی لاش ہے! یہ میری آنکھوں کا نور، میرے دل کا سرور۔ یہ لخت جگر ہے جس کی ذات سے زندگی کی ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ اب تمہیں اس کی صورت یاد آگئی ہوگی۔ لیکن خدا جانتا ہے۔ اس کی موت پر میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔ تمہیں حیرت ہو رہی ہوگی۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک گھنٹہ قبل تک اس پر نثار ہوتا تھا۔ لیکن اب اس کے نام سے نفرت ہو رہی ہے۔ اس نے وہ فعل کیا ہے۔ جو انسانیت کے درجہ سے گرا ہوا ہے۔ تمہیں املیا کے بارے میں تو کوئی خبر ملی ہوگی؟

چکردھر۔ جی ہاں۔ شاید کچھ بدمعاش اسے پکڑ لے گئے۔

خواجہ۔ یہ وہی بدمعاش ہے۔ جس کی لاش تمہارے سامنے پڑی ہوئی ہے۔ وہ اسی کی حرکت تھی۔ میں تو سارے شہر میں املیا کو تلاش کرتا پھرتا تھا اور وہ میرے ہی گھر میں قید تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی عالی خاندان لڑکی ہے۔ کاش اس ملک میں ایسی اور لڑکیاں ہوتیں۔ آج اس نے موقع پا کر اسے جہنم کا راستہ دکھا دیا سینے میں چھری چبھو دی۔ ظالم تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اپنے لڑکے کی موت پر کون باپ روئے گا۔ تم بڑے خوش نصیب ہو کہ ایسی پارسا بیوی پاؤ گے۔ ابھی اسی گھر میں ہے۔ صبح سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ چل تجھے تیرے گھر پہونچا آؤں مگر جاتی ہی نہیں بس بیٹھی رو رہی ہے۔

اس سانحہ نے چکردھر کے حواس کو مفلوج کر دیا۔ رنج یا تعزیت کا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکلا۔

جنازہ اٹھایا گیا۔ سوگواروں کا ایک جم غفیر جنازہ کے ساتھ تھا۔ چکردھر بھی خواجہ صاحب کے ساتھ قبرستان تک گئے۔ جس وقت لاش قبر میں اتاری گئی۔ خواجہ صاحب رو پڑے۔ ہاتھوں سے مٹی لے لے کر ڈالتے تھے اور آنکھوں سے اشک کی

بوندیں مرنے والے کی میت پر گر رہی تھیں۔ چکردھر بھی آنسوؤں کو نہ روک سکے۔

دوپہر ہوتے ہوتے لوگ گھر لوٹے۔ خواجہ صاحب ذرا دم لے کر بولے۔ آؤ بیٹا! تمہیں اہلیا کے پاس لے چلوں۔ اسے ذرا تشفی دو۔

یہ کہہ کر خواجہ صاحب نے چکردھر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اندر چلے۔ چکردھر کا دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ وہ خیال کر رہے تھے: اہلیا کی اس وقت کچھ اور ہی حالت ہوگی۔ آنکھیں سرخ ہوں گی؛ چہرہ غضبناک۔ ایک ایک عضو سے شعلے نکل رہے ہوں گے۔ مگر جب اس پر نگاہ پڑی تو دیکھا وہی لجاجت، وہی متانت، وہی شرمیلا پن، وہی درد اور رقت سے بھری آنکھیں، ایک کھڑکی کے سامنے کھڑی باغیچہ کی طرف تاک رہی تھی۔ چکردھر کو دیکھ کر وہ چونک پڑی اور گھونگٹ میں منہ چھپا لیا پھر ایک ہی لحہ میں وہ ان کے پیروں کو پکڑ کر آنسوؤں سے دھونے لگی۔ اُن قدموں پر سر رکھے ہوئے اُسے ایک روحانی تسکین، ایک غیبی طاقت، اور صبر آمیز سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

چکردھر نے کہا۔ اہلیا! تم نے جس بہادری سے اپنی عصمت کی حفاظت کی اس پر میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں۔ تم نے بیر چھتر انیوں کی یاد تازہ کر دی اگر افسوس ہے تو یہی کہ خواجہ صاحب کا گھر تباہ ہو گیا۔

اہلیا نے کوئی جواب نہ دیا، سر جھکائے بیٹھی رہی۔ چکردھر پھر بولے۔ مجھے شرمندہ نہ کرو اہلیا (مجھے تمہارے قدموں پر سر جھکانا چاہیے۔ تمہی گنگا بہا رہی ہو۔ کہاں ہے وہ چھری؛ ذرا اسکے درشن تو کر لوں)

اہلیا نے اٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فرش کا کونا اٹھایا اور نیچے سے ایک چھری نکال کر چکردھر کے سامنے رکھ دی۔ اس پر خون جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔

چکردھر نے پوچھا۔ یہ چھُری تمہیں یہاں کیسے مِل گئی اہلیا؟ کیا ساتھ لیتی آئی تھیں۔

اہلیا نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ اسی کی ہے۔

چکردھر۔ تمہیں کیسے مِل گئی۔؟

اہلیا۔ یہ نہ پوچھئے۔ بیکسوں کے پاس اپنی آبرو کی حفاظت کے لئے مکروفریب کے سوا اور کونسا وسیلہ ہے۔

چکردھر۔ یہی تو سُننا چاہتا ہوں اہلیا۔!

اہلیا نے سر اٹھاکر چکردھر کی طرف پرغرور نظروں سے دیکھا اور بولی۔ سُنکر کیا کیجئے گا۔

چکردھر۔ کچھ نہیں یونہیں پوچھ رہا تھا۔

اہلیا۔ نہیں آپ یوں ہی نہیں پوچھ رہے ہیں۔ اِس سے آپکی کوئی خاص منشا ہے۔ اگر کوئی شُبہ ہو تو میری اگنی پریکشا لے لیجئے۔

چکردھر نے دیکھا۔ بات بگڑ رہی ہے۔ سمجھے شاید میرے بے موقع سوال نے اہلیا کے زخمی دِل کو ٹھیس لگادی۔ یہ سمجھ رہی ہے، میں اس پر شُبہ کر رہا ہوں۔ بولے تمہاری اگنی پریکشا تو ہوچکی اہلیا۔ اور تم اِس میں کھری نکلیں۔ اب بھی اگر کسی کے دِل میں شُبہ ہو تو سمجھنا چاہئے۔ وہ اپنی عقل کھو بیٹھا ہے۔ تم گُل نوبہار کی طرح پاکیزہ اور پہاڑ کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کی طرح بے لوث ہو۔ میرے دِل میں کسی بات کا گمان بھی ہوتا تو تم مجھے یہاں زندہ نہ دیکھتیں۔ وہ محبت اور وہ اعتماد کمال جو مجھے تم پر ہے وہ اب روشن ہوجائے گا۔ اہلیا، میں کب کا تمہیں اپنے دِل میں بٹھا چکا۔ وہاں تم محفوظ بیٹھی ہو۔ شُبہ یا بدگمانی کا قاتل ہاتھ وہاں اسی وقت پہونچیگا۔ جب (سینے پر ہاتھ رکھ کر) یہ قلعہ

مسمار ہو جائے گا۔ چلو گھر چلیں۔ ماتا جی گھبرا رہی ہوں گی۔

یہ کہہ کر انہوں نے اہلیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ اُسے سینے سے لگا لیں۔ لیکن وہ ہاتھ چھڑا کر ہٹ گئی اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ نہیں، نہیں، میرے جسم میں ہاتھ نہ لگایئے۔ سونگھا ہوا پھول دیوتاؤں پر نہیں چڑھایا جاتا میں اب وہاں نہ جاؤں گی۔ کہیں نہ جاؤں گی۔ آپ کی خدمت کرنا میری تقدیر میں نہ تھا میں نامراد پیدا ہوئی اور نامراد ہی مروں گی۔ آپ میرے لئے افسوس نہ کریں اماں جی کو بھی سمجھا دیجئے گا......

چکردھر سے اب نہ رہا گیا۔ انہوں نے پھر اہلیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔ اہلیا! جس جسم میں پاکیزہ اور بے داغ روح جلوہ گزین ہوتی ہے۔ وہ جسم بھی پاکیزہ اور بے لوث ہو جاتا ہے۔ میری نظروں میں تم آج اس سے کہیں زیادہ پاکیزہ ہو جتنی پہلے تھیں۔ تمہاری آزمائش ہو چکی ہے۔ اب دیر نہ کرو۔ ایشور نے چاہا تو کل ہم اس محبت کے رشتے میں بندھ جائیں گے۔ جسے ایام کی گردش بھی نہیں توڑ سکتی۔ جو لافانی اور لازوال ہے۔

اہلیا کئی منٹ تک چکردھر کے کندھے پر سر رکھے روتی رہی اور بولی۔ ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں بتاؤ گے؟ سچے دل سے کہنا۔

چکردھر۔ کیا پوچھتی ہو۔ پوچھو۔

اہلیا۔ تم صرف میرے اوپر ترس کھا کر یہ رسوائی کا بوجھ اپنے سر پر لے رہے ہو۔ یا سچی محبت سے؟

اس سوال سے وہ خود شرمندہ ہوئی پھر کہا۔ بات بے ڈھنگی سی ہے لیکن معاف کرنا میں نادان ہوں۔ یہ خیال میرے دل میں بار بار پیدا ہوتا تھا۔ پہلے بھی ہوا تھا اور اب تو اور بھی ہو رہا ہے۔

چکردھر کا دل بیٹھ گیا۔ الیا کی سادگی اور صاف گوئی نے انہیں ان باتوں کے اظہار کے لئے مجبور کر دیا جو وہ نہ کہنا چاہتے تھے۔ ہاں! اسکا رنج ضرور ہوا کہ وہ انہیں اتنا سفلہ اور تنگ نظر سمجھ رہی ہے۔ بولے۔ تمہیں کیا معلوم ہو رہا ہے الیا!

الیا۔ میں جانتی تو آپ سے پوچھتی کیوں۔

چکردھر۔ الیا تم ان باتوں سے مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں چیل کو چاہے گوشت کا ٹکڑا نظر آئے۔ چیونٹی کو چاہے شکر کی خوشبو کا احساس نہ ہو۔ لیکن حسن کے وجود کا ایک ایک ذرہ حواس خمسہ کی طرح محبت کی صورت ذائقہ، بو آواز اور لمس کا احساس کر لیتا ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ رحم اور فرض کے اصولوں سے میں واقف نہیں۔ صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔ تمہیں پاکر مجھے پھر کسی چیز کی ہوس نہ رہے گی۔

الیا نے مسکرا کر کہا۔ تو آپ کے قول کے مطابق میں آپ کے دل کا حال جانتی ہوں۔

چکردھر۔ بیشک! اس سے زیادہ جتنا میں خود جانتا ہوں۔

الیا۔ تو صاف صاف کہدوں۔

چکردھر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ کہو سنوں۔

الیا۔ تمہارے دل میں محبت سے زیادہ رحم کا خیال ہے۔

چکردھر۔ بالکل غلط ہے الیا! تم میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہو۔

الیا۔ ابھی آپ نے کہا۔ کہ میں آپکے دل کا حال آپ سے زیادہ جانتی ہوں اسلئے اب آپ کو قیل وقال کی گنجائش نہیں۔ جس چیز کو لینے کی میری بساط نہیں ہے۔ اسپر ہاتھ نہ بڑھاؤں گی۔ میرے لئے وہی بہت ہے۔ جو آپ سے پہلے پا چکی ہیں

سے بھی اپنی خوش نصیبی سمجھتی ہوں۔

چکردھر۔ تم نے تو میری زبان بند کر دی۔ اگر یہی سوال میں تم سے کرتا تو تم کیا جواب دیتیں۔

اہلیا۔ تو میں صاف صاف کہدیتی کہ میں آپ کی محبت سے زیادہ آپ کی تعظیم کرتی ہوں۔

چکردھر کا منہ لٹک گیا۔ ساری گرمیٔ الفت غائب ہو گئی۔ مایوسانہ انداز سے بولے۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اہلیا!

اہلیا۔ تو آپ غلطی کر رہے تھے۔ میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ محبت دل کی ساری کیفیات کے توازن کا نام ہے۔ اس میں رحم اور عفو، ہمدردی اور عزت، اعتقاد اور اعتماد، خدمت اور احسان سبھی شامل ہوتے ہیں۔ ممکن ہے آج کے دس سال بعد میں آپکے دل کی مالک بن جاؤں۔ لیکن اتنی جلد ممکن نہیں ان جذبات میں سے کوئی ایک محبت کو بیدار کر لے کے لئے کافی ہو سکتا ہے پر اس کا نشو ونما دیگر جذبات کی آمیزش سے ہی ہوتا ہے۔ آپ کے دل میں ابھی صرف رحم کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ میرے دل میں تعظیم اور اعتقاد کا۔ اور تعظیم اور اعتقاد رحم کی نسبت محبت سے قریب تر ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہی جذبات دلکش ہو کر محبت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اہلیا کے منہ سے محبت کی ایسی فلسفیانہ تشریح سُنکر چکردھر دنگ رہ گئے انہیں گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی بیدار مغز اور عقیل ہے۔ انہیں اس خیال سے مسرت ہوئی کہ اسکے ساتھ زندگی کتنی پُر لطف ہو جائے گی۔ مگر اہلیا کا ہاتھ انکے ہاتھ سے آپ ہی آپ چھوٹ گیا۔ اور انہیں اسکی طرف تاکنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اسکی محبت کا معیار کتنا اعلےٰ ہے۔ شاید یہ گفتگو اس کی نظروں میں نفسانیت

سے ملوث ہوگی۔ اس خیال نے انکے جذبات کو مفلوج کر دیا۔ بے حس و حرکت کھڑے رہ گئے۔

دفعتہً اہلیا نے کہا۔ مجھے خوف ہے کہ مجھ سے رشتہ کرکے آپ رسوا نہ ہو جائیں شاید آپ کے والدین آپ سے کنارہ کش ہو جائیں۔ میرے لئے اس سے زیادہ خوش نصیبی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ آپ کی خادمہ ہوں لیکن آپکی رسوائی اور تحقیر کا خیال کرکے بھی دل میں آ جاتا ہے۔ کہ کیوں نہ اس زندگی کا خاتمہ کر دوں محض آپکے دیدار کی تمنا نے مجھے اب تک زندہ رکھا ہے۔ میں آپ کو اپنے داغوں سے داغدار بنانے کے پہلے مر جانا اچھا سمجھتی ہوں۔

چکر دھر نے دردناک لہجے میں کہا۔ ایسی باتیں نہ کرو اہلیا۔ اگر دنیا میں اب بھی کوئی ایسا کمینہ آدمی ہے۔ جو تمہاری دلیرانہ جان نثاری کی قدر نہ کرے۔ تو وہ انسان نہیں۔ اور نہ میں والدین کی رضامندی پر اپنے ضمیر کی آزادی کو قربان کر سکتا ہوں میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ دل میں ایسے خیالات کو جگہ دے کر مجھے خفیف نہ کرو۔

اہلیا نے اب کی محبت سے سرشار آنکھیں چکر دھر کی طرف پھیریں۔ وہ آگ جو اس کے دل و دماغ کو جلائے ڈالتی تھی بجھ گئی۔ اور اس کی پر سکون نگاہوں میں چکر دھر نورانی محبت سے مسرور دکھائی دیئے۔

شام کے وقت اہلیا اپنے گھر پہنچی۔ باگیشوری اس سے گلے لپٹ کر رو رہی تھی۔ اور چکر دھر کھڑے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس گھر کو دیکھ رہے تھے۔ سب کچھ وہی تھا پر ماتم کے گہرے رنگ میں رنگا ہوا۔

جشنِ دانندن کے آخری مراسم ادا ہو گئے۔ مگر دھوم دھام سے نہیں۔ یہ مرنے والے کی آخری وصیت تھی ؛

اس کے تیسرے ہی دن چکر دھر اور اہلیا کی قسمتیں باہم مربوط ہو گئیں چکر دھر تو ابھی کچھ دن اور ٹالنا چاہتے تھے۔ لیکن باگیشوری بہت مُصر تھی۔ شوہر کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد وہ ایک پرائی لڑکی کی حفاظت کا بار نہ لینا چاہتی تھی شادی میں کسی قسم کی نمائش نہ کی گئی۔ ہاں شہر کے کئی رئیسوں نے کنیا دان میں بڑی بڑی رقمیں دیں۔ اور سب سے بڑی رقم خواجہ محمود کی تھی۔ افتراق کا بھوت وہ قربانیاں پاکر خاموش ہو گیا تھا ؛

جس دن چکر دھر اہلیا کو رخصت کرا کے گھر چلے' ہزاروں آدمی اُنہیں اسٹیشن پر پہونچانے آئے۔ باگیشوری کا روتے روتے بُرا حال تھا۔ جی چاہتا تھا اہلیا کو پکڑ لوں ؛

لیکن چکر دھر کے سامنے ایک دوسرا ہی مرحلہ درپیش تھا۔ وہ گھر تو جا رہے تھے۔ لیکن اس گھر کے دروازے اُن کے لئے بند تھے۔ اور ان پر دل کی گانٹھ سے بھی زیادہ مضبوط قفل پڑا ہوا تھا۔ جس کے کھلنے کی تو کیا ٹوٹنے کی بھی اُمید نہ تھی۔ نویلی دولہن کو ساتھ لئے ہوئے نوشے کے دل میں جو مسرتیں ہنگامہ خیز ہوتی ہیں۔ ان کا یہاں نشان بھی نہ تھا۔ باپ کا غصہ، ماں کی ناراضگی، رشتہ داروں کا احتراز، ساری مصیبتیں گھر پر ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ تھا۔ کہ گاڑی سے اُتر کر جائینگے کہاں۔ احباب کی کمی نہ تھی۔ لیکن دولھن کو ساتھ لئے ہوئے کسی دوست کے گھر جانے کے خیال ہی سے شرم آتی تھی۔

اپنی تو زیادہ فکر نہ تھی۔ وہ یہ سبھی مشکلات برداشت کر سکتے تھے۔ لیکن اہلیا انہیں کیسے جھیلے گی۔ انہوں نے سوچا وہ گھر جائیں ہی کیوں۔ کیوں نہ الہ آباد میں اُتر پڑیں۔ کچھ دنوں کے بعد جب والدین کا غصہ فرو ہو جائے تو چلے جائیں۔ ان تفکرات سے انکا چہرہ اتنا اُترا ہوا تھا۔ کہ اہلیا نے ان کی طرف دیکھا تو چونک پڑی۔ بولی۔ آپ اتنے متفکر کیوں ہیں؟ کیا ابھی سے میری فکر سوار ہو گئی۔

چکردھر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ متفکر تو نہیں ہوں۔ یہ تو خوش ہونے کا موقع ہے۔

اہلیا۔ یہ تم اپنی صورت سے پوچھو۔

چکردھر نے ہنسنے کی ناکام کوشش کر کے کہا۔ میں تو اتنا خوش ہوں۔ کہ ڈرتا ہوں لوگ مجھے کم ظرف نہ سمجھنے لگیں۔

مگر چکردھر اپنے اضطراب کو جتنا ہی چھپاتے تھے۔ اتنا ہی وہ اور بھی عیاں ہوتا جاتا تھا۔ جیسے کوئی مفلس اپنی ساکھ بنائے رکھنے کی کوشش میں اور بھی مفلس ہوتا جاتا ہے۔ اہلیا نے گلا کر کے کہا۔ خیر اگر نہیں بتانا چاہتے نہ بتاؤ۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔

چکردھر اب خاموش نہ رہ سکے۔ والدین کی ناراضگی کی داستان اول سے آخر تک کہہ سنائی۔ اور الہ آباد اُترنے کی تجویز پیش کی۔

اہلیا نے خودداری کی شان سے کہا۔ نا گھر رہتے الہ آباد کیوں اُتریں۔ ماں باپ کی ناراضگی کے خوف سے کوئی اپنا گھر نہیں چھوڑ دیتا۔ وہ کتنے ہی ناراض ہوں ہیں تو اپنے ہی ماں باپ۔ ہم لوگوں نے کتنی ہی بے جا حرکت کی ہو پر ہیں تو انہیں کی اولاد۔ اس رشتہ کو کون توڑ سکتا ہے۔ آپ ان فکروں کو دل سے نکال ڈالیئے۔

چکردھر۔ نکالنا تو چاہتا ہوں پر نکلتے نہیں۔ بابوجی کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہو سکتی ہے وہ ہے۔ لیکن ان کے مذہبی اور مجلسی خیالات اتنے تنگ ہیں کہ ان میں وہم کی گنجائش بھی نہیں۔ مجھے خوف ہے کہ وہ ہمیں گھر میں جانے ہی نہ دینگے اس میں کیا حرج ہے کہ ہم لوگ الہ آباد اُتر پڑیں۔ اور جب تک گھر کے لوگ ہمارا خیر مقدم کرنے کو تیار نہ ہوں۔ یہیں رہیں۔

اہلیا۔ آپ کو کوئی حرج نہ معلوم ہوتا ہو تو رہئے۔ مجھے تو ماں باپ سے الگ جنت میں بھی رہنا ہو تو اچھا نہ لگے۔ آخر تمہیں ان کی خدمت کرنے کا اور کونسا موقع ملے گا۔ بچپن میں تو ہم ماں باپ کی ناراضگی کا بُرا اثر نہیں مانتے۔ مچل مچل کر اُن کی گود میں بیٹھتے ہیں۔ مار کھاتے ہیں گھڑکے جاتے ہیں۔ مگر ان کا گلا نہیں چھوڑتے تو اب ان کی خدمت کرنے کے موقع پر ان کی ناخوشی پر مُنہ پھُلا لینا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا ٭

رات کے دس بجتے بجتے گاڑی بنارس پہونچی۔ اہلیا کے اطمینان دلانے پر بھی چکردھر بہت متفکر ہو رہے تھے۔ کہیں داد اسے جانے ہی جاتے گھر کیا ل چھانی شروع کیں اور اہلیا کو گھر میں نہ جانے دیا۔ تو ڈوب مرنے کی بات ہوگی لیکن اُنہیں کتنا تعجب ہوا۔ جب انہوں نے منشی جی کو دو آدمیوں کے ساتھ اسٹیشن پر اپنی انتظار میں کھڑے پایا۔ منشی جی کی اِس بزرگانہ شفقت نے اُنہیں اتنا متاثر کیا۔ کہ جا کر اُنکے پیروں پر گر پڑے۔ منشی جی نے اُنہیں سینے سے لگا لیا اور اُن کے اشک سعادت کو رومال سے پونچھتے ہوئے محبت آمیز لہجہ میں بولے کہ کم سے کم ایک تار تو دے دیتے کہ فلاں گاڑی سے آرہا ہوں۔ خط تک نہ لکھا یہاں برابر دس دن سے دو دفعہ اسٹیشن پہ دوڑا آتا ہوں اور ایک آدمی ہردم تمہارے انتظار میں بٹھا رکھتا ہوں کہ نہ جانے آپ کس گاڑی سے آجاؤ۔ کہاں ہے بہو چلو اُتارو

لائیں۔ بہو کے ساتھ یہیں ٹھیرو۔ اسٹیشن ماسٹر سے کہکر ویٹنگ روم کھلوائے دیتا ہوں میں دوڑکر ذرا باجے گاجے کی فکر کروں۔ یہاں لوگ کیا جانیں گے کہ بہو آئی ہے۔ وہاں کی بات اور تھی۔ یہاں کی بات اور ہے۔

چکردھر نے منشی جی کو اہلیا کے ڈبے پر لاکے کھڑا کر دیا۔ اہلیا نے آہستہ سے اُن کران کے قدموں پر سر رکھا منشی جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور دونوں آدمیوں کو ویٹنگ روم میں بٹھا کر بولے۔ میں کوئی گھنٹے بھر میں آجاؤں گا تم سے بڑی غلطی ہوئی مجھے تار نہ دے دیا۔ اب بیچاری بہو یہاں پردیسیوں کی طرح گھنٹوں بیٹھی رہے گی۔ تمہارا کوئی کام لڑکپن سے خالی نہیں ہوتا۔ چھوٹی رانی صاحب کئی بار آچکی ہیں۔ آج چلتے چلتے تاکید کر گئی ہیں کہ بابو جی آجائیں تو مجھے خبر دیجئے گا۔ میں اسٹیشن پر ان کا استقبال کروں گی۔ اور بہو کو ساتھ لاؤنگی سوچا انہیں کتنی تکلیف ہوگی۔

چکردھر نے انکسار کے ساتھ کہا۔ انہیں تو آپ اس وقت تکلیف نہ دیجئے۔ اور رات کو بھی اس وقت باجے گاجے کے لئے تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ سویرے تو سب کو معلوم ہو ہی جائے گا۔

منشی جی نے لکڑی سنبھالتے ہوئے کہا تم سنی ہو ہوان کی باتیں۔ سویرے سے لوگ جان کر کیا کریں گے۔ دُنیا کیا جانے گی کہ بہو کب آئی۔

منشی جی چلے گئے تو اہلیا نے چکردھر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ تم تو کہتے تھے۔ بڑے بدمزاج ہیں۔ مجھے تو یہ دیوتا معلوم ہوتے ہیں۔

چکردھر شرمندہ ہو گئے۔ اسکی تردید نہ کی۔ مگر ان کا دل کہہ رہا تھا کہ داوا اسوقت دُنیا کو دکھانے کے لئے کتنی ہی دھوم دھام کیوں نہ کرلیں، گھر میں کوئی نہ کوئی گل کھلے گا ضرور۔ انہیں یہاں بیٹھنا ناگوار گذر رہا تھا۔ ساری رات کا جھمیلا ہو گیا

شہر کی گشت لگانی پڑے گی۔ گھر پہنچکر نہ جانے کتنی رسمیں ادا کی جائیں گی۔ تب کہیں جا کے گلا چھوٹے گا ۔

منشی جی کو ابھی گئے آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا۔ کہ منورما آکر کمرے کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ چکردھر چونک پڑے اور کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ منورما سے آنکھیں چار کرنے کی ان کی ہمت نہ پڑی۔ گویا کوئی تقصیر کی ہو۔ منورما نے اُنہیں دیکھتے ہی کہا۔ واہ۔ بابو جی! آپ چپکے چپکے بہو کو اڑا لائے اور مجھے خبر تک نہ دی۔ منشی جی نہ کہتے تو مجھے معلوم بھی نہ ہوتا۔ آپ نے اپنا تو گھر بسا یا، میرے لئے بھی تو کوئی سوغات لائے ؟

چکردھر نے منورما کی طرف منجل آنکھوں سے دیکھا۔ تو اس کا چہرا اوڑا ہوا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی پر آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ ان آنکھوں میں کتنی التجا تھی۔ اور کتنی مایوسی۔ چکردھر کو اس کا جواب دینے کے لئے الفاظ نہ ملے۔

اہلیا بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ منورما نے اُس کے پاس جا کر کہا۔ آؤ بہن! تم سے تو گلے مل لوں۔ میری شکایت تو ان سے ہے۔

یہ کہہ کر وہ اہلیا کے پاس گئی اور اُسے گلے سے لگا کر اپنا جڑاؤ کنگن اہلیا کے ہاتھ میں پہنا دیا۔ دفعتاً اس کی نگاہ آئینے پر جا پڑی۔ اہلیا کا چاند سا چہرہ اپنے سارے دلفریبیوں کے ساتھ اس میں منعکس ہو رہا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی دیوتا کا اشیرباد صورت پذیر ہو کر آسمان سے اُتر آیا ہے۔ اس کی نازک شرمیلی اور متین اداؤں کے سامنے اس کا شکوہ حسن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کسی سادھو کی کٹی کے سامنے کوئی شاہی ایوان کھڑا ہو۔ وہ ایوان اُس کٹی کے سامنے اِس وقت جھک گیا۔ ایوان ویران تھا۔ کٹی میں ایک نورانی وجود جلوہ افروز تھا ۔

اہلیا نے اُسے کُرسی پر بٹھا دیا ؛ اور پان الائچی پیش کرتی ہوئی بولی۔ میری وجہ سے آج آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ یہ آپ کے آرام کا وقت تھا۔

چکردھر باہر چلے گئے۔ وہ جانتے تھے کہ میرے روبرو دونوں کو باتیں کرنے میں حجاب ہوگا۔

منورما نے گرسنہ آنکھوں سے اہلیا کو دیکھ کر کہا۔ نہیں بہن اب مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں تو یوں ہی بارہ ایک بجے تک نہیں سوتی۔ تم سے ملنے کا مُدت سے اشتیاق تھا۔ میں نے اپنے دِل میں تمہاری جو صورت کھینچ رکھی تھی۔ تم بعینہٖ ویسے ہی نکلیں۔ جبھی تو بابو جی تم پر فدا ہو گئے۔ تم خوش نصیب ہو۔ تم نے زندگی کا ایسا رفیق پایا ہے۔ جو ظاہر میں انسان اور باطن میں فرشتہ ہے۔

اہلیا نے مسکرا کر کہا۔ آپ کے لئے کوئی سوغات تو لائے ہی نہیں۔

منورما۔ میرے لئے تم سے بڑھکر اور کیا سوغات لاتے۔ میں دُنیا میں اکیلی تھی۔ تمہیں پاکر دو کیلی ہو جاؤں گی۔ منگلا سے میں نے محبت نہیں بڑھائی۔ کل کو وہ پرائے گھر چلی جائے گی۔ کون اُسکے نام پر بیٹھ کر روتا۔ تمہیں سہیلی بنانے میں کوئی اندیشہ نہیں۔ آج سے تم میری سہیلی ہو۔ ایشور سے میری یہی دعا ہے۔ کہ ہم اور تم آخر تک محبت کے رشتہ میں بندھی رہیں۔

اہلیا۔ میں اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ آپکے حُسنِ اخلاق کی تعریف کرتے ان کی زبان نہیں تھکتی۔

منورما نے بے صبر ہوکر پوچھا۔ سچ، میرا ذکر کبھی کرتے ہیں؟

اہلیا۔ برابر بات بات پر آپ ہی کا تذکرہ آجاتا ہے۔

اتنے میں باجوں کی دھوں دھوں پوں پوں سنائی دی منشی جی بارات سجائے چلے آرہے تھے۔ سامان تو پہلے ہی سے جمع کر رکھے تھے، جاکر لے آنا تھا۔

اہلیا کے دل میں خوشی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اُسے جن باتوں کا خواب میں بھی گمان نہ تھا۔ وہ سب پوری ہوتی جاتی تھیں۔ کبھی اُس کا خیر مقدم اِس شان سے ہوگا کبھی ایک بڑی رانی اس کی سہیلی بنے گی۔ اُس نے سوچا بھی نہ تھا۔

منورما نے اُسے آہستہ سے لاکر سکھپال پر بٹھا دیا۔ برات چلی۔ چکردھر ایک سبزہ گھوڑے پر سوار تھے۔

ایک لمحہ میں سناٹا ہوگیا۔ لیکن منورما ابھی تک اپنی موٹر کے پاس کھڑی تھی۔ گویا راستہ بھول گئی ہو۔

(۲۹)

گروسیوک سنگھ جگدیش پور کے ناظم ہو گئے تھے۔ تینوں پہلی رانیاں وہیں رہتی تھیں۔ ان کے آسائش و آرام کے لئے ضروری چیزیں مہیا کرنا ان کا کام تھا۔

تینوں رانیوں میں اب معرکہ آرائیاں بہت کم ہوتی تھیں۔ اب ہر ایک کو اختیار تھا۔ جتنے نوکر چاہے رکھے۔ جتنے زیور چاہے بنوائے۔ جتنی نقد ہمیں چاہے منائے۔ پھر قضیہ کس بات کے لئے ہوتا۔ راجہ صاحب کو کسی رانی سے خاص الفت نہ تھی۔ نفاق کا یہ سب سے بڑا سبب بھی اب نہ تھا۔

ٹھاکر صاحب نے دیوان خانہ میں اپنا دفتر بنا لیا تھا۔ رانیاں اُن سے پردہ تو کرتی تھیں۔ مگر پردے کی اوٹ سے بات چیت کرلیتی تھیں۔ بسومتی اِس اوٹ کو بھی فضول سمجھتی تھی۔ اس کا دل دُنیا سے بیزار ہو گیا تھا۔ دن بھر دھیان پوجا میں مصروف رہتی تھی۔ رو ہنی سے اُن کا خوب میل جول تھا۔ دونوں اکثر ساتھ ساتھ رہتیں۔ بسومتی کو زیوروں کا شوق اب بھی تھا۔ روہنی کو ان سے نفرت ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ مانگ میں سیندور ڈالنا بھی اب چھوڑ دیا تھا۔ کہتی، مجھ

ہیں اور بیوہ میں اب فرق کیا ہے۔ بلکہ بیوہ مجھ سے ہزار درجہ اچھی۔ اُسے ایک یہی رونا ہے کہ شوہر نہیں، جلن تو نہیں۔ یہاں تو زندگی رونے اور کڑھنے میں کٹ رہی ہے۔ رہی رانی رام پریا۔ اُنہیں آجکل گانے کی دھن سوار تھی۔ طرح طرح کے باجے منگاتی رہتی تھیں۔ ٹھاکر صاحب نے بھی کچھ گانے کا شوق پیدا کر لیا تھا۔ کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈ کر رام پریا کے پاس جا بیٹھتے۔ رات کو اکثر کھانا بھی وہیں کھا لیتے۔ رام پریا انکے لئے خود تھال پروس کر لاتی تھی۔ ٹھاکر صاحب کی جو اتنی خاطر ہونے لگی۔ تو مزاج آسمان پر چڑھ گیا۔ نوکروں پر رعب جمانے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ راجہ وہی ہیں۔ دن دن یہ یقین ہوتا جاتا تھا۔ کہ رام پریا میرے تیر نگاہ کا شکار ہو گئی ہے۔

ایک دن آپ نے رام پریا کی محبت کا امتحان لینے کی ٹھانی۔ کمرے میں لحاف اوڑھ کر پڑ رہے۔ رام پریا نے کسی کام کے لئے بلا بھیجا۔ تو کہلا دیا۔ مجھے رات سے زوروں کا بخار ہے۔ رام پریا یہ سنتے ہی دیوان خانہ میں آ پہونچی۔ اور انکے سر پر ہاتھ رکھکر دیکھا۔ پیشانی سرد تھی۔ سمجھی کچھ سر بھاری ہو گیا ہوگا۔ کچھ پرواہ نہ کی۔ اندر جاکر ایک تیل سر میں لگانے کو بھجوا دیا۔

ٹھاکر صاحب کو اس امتحان سے اطمینان نہ ہوا۔ اُسے محبت ہے یہ تو واضح تھا۔ ورنہ وہ دیکھنے دوڑی آتی ہی کیوں۔ لیکن محبت کی گہرائی کا کچھ اندازہ نہ ہوا۔ کہیں وہ محض خاطرداری نہ کر رہی ہو۔ اسکے ہونٹھوں پر، آنکھوں میں، باتوں میں تو اُنہیں محبت کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن اسکا وہ کوئی صریح ثبوت چاہتے تھے اسلئے انہوں نے کوئی سخت امتحان لینے کا ارادہ کیا۔

کنوار کا مہینہ تھا۔ ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ آپ ایک دن سارے دن پیدل کھیتوں میں گھومتے رہے۔ اور کئی بار تالاب کا پانی بھی پیا۔ بخار کا پورا سامان

کر کے گھر لوٹے۔ نتیجہ ان کے خاطر خواہ ہی ہوا۔ دوسرے دن صبح کو انہیں بخار چڑھ آیا۔ اور ایسے زور سے آیا کہ دوپہر تک سرسام کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اب تو بیچاروں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ محبت کے امتحان میں ان کے صبر کا امتحان ہونے لگا اور اس میں وہ کچے نکلے۔ اتنا چیخے چلائے کہ نوکروں کا ناکوں دم ہو گیا۔ رام پریا نے آکر دیکھا تو حالت خراب تھی۔ بیچاری گھبرا اٹھی۔ فوراً ڈاکٹر بلانے کے لئے ایک آدمی کو شہر دوڑایا۔ اور آپ ٹھاکر صاحب کے سرہانے بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگی۔ ٹھاکر صاحب کو ہوش ہوتا اور رام پریا کی سب بے چینی دیکھتے تو پھولے نہ سماتے۔ لیکن وہاں تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

ایک ہفتہ تک گروسیوک کا بخار نہ اترا۔ رام پریا کو دانہ پانی حرام ہو گیا۔ دن کے دن اور رات کی رات ان کی تیمارداری میں حاضر رہتی۔ کسی نوکر پر اسے اعتبار نہ تھا۔

اب لوگوں کو فکر پیدا ہوئی۔ مریض کو یہاں سے اٹھا کر لیجانے میں اندیشہ تھا۔ سارا خاندان یہیں آپہونچا۔ اور راجہ صاحب بھی دن میں ایک دوبار منورما کے ساتھ مریض کی عیادت کرنے آجاتے لیکن اس طرح بھاگتے۔ گویا کسی دشمن کے گھر آتے ہیں۔ رام پریا تو مریض کی تیمارداری میں مصروف رہتی۔ اسے اسکی پرواہ نہ تھی۔ کہ کون آتا ہے اور کون جاتا ہے۔ لیکن روہنی کو راجہ صاحب کی یہ سرد مہری بہت شاق گذری۔ وہ اُن پر دل کا غبار نکالنے کے لئے موقع کی تلاش کرتی رہتی تھی۔ آخر ایک دن وہ منورما ہی پر پل پڑی۔ بات کچھ نہ تھی۔ منورما نے تجاہل سے کہا تھا۔ یہاں آپ لوگوں کی زندگی بڑے سکون سے کٹتی ہو گی۔ شہر میں تو روز ایک نہ ایک خلجان ہوتا رہتا ہے۔ ناکوں دم رہتا ہے۔

روہنی اٹھ کر بولی۔ ہاں بہن، کیوں نہ ہو۔ دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں جنہیں

ہمسایہ کے گھر فاقہ دیکھ کر بھی جلن ہوتی ہے کسی کو بھوگ کسی کو جوگ۔ یہ پُرانا دستور چلا آتا ہے۔ تم کیا کروگی۔

منورما نے پھر اُسی بھولے پن سے کہا۔ اگر تمہیں وہاں کی زندگی بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ تو چلی کیوں نہیں آتیں۔ تمہیں کسی نے منع کیا ہے۔؟

روہنی ناک سکوڑ کر بولی۔ بھلا مجھ میں وہ ہنر کہاں ہے کہ اِدھر راجہ کو مٹھی میں لئے رہوں۔ اُدھر حکام کی ناز برداری بھی کروں۔ یہ ہنر تو پڑھی لکھی شہر والیوں کو آتا ہے۔ ہم گنوار ہیں۔ یہ تریا چرتر کیا جائیں۔ یہاں تو ایک ہی کی ہو کر رہنا جانتی ہیں۔

منورما کو سکتہ سا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک شعلہ پیروں سے اٹھا اور سر سے نکل گیا۔ گویا کسی نے ہزاروں بھالے کلیجے میں چبھا دیئے۔ سارے اعضا مفلوج سے ہو گئے۔ اس کی خبر ہی نہ رہی کہ کہاں آئی ہوں، کیا کر رہی ہوں۔ رات ہے یا دن۔ وہ دس بارہ منٹ تک اسی طرح نقش دیوار بنی کھڑی رہی۔ راجہ صاحب موٹر پر بیٹھے، اُسے بار بار بلوا بھیجتے تھے۔ اور اُسے خبر نہ ہوتی تھی۔ آخر راجہ صاحب اندر آئے۔ دیکھا منورما بے حس و حرکت کھڑی ہے۔ دُور ہی سے پکارا نورا کیا کر رہی ہو۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔ سات بجے لیڈی کا پ نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور ساڑھے چھ یہیں بج گئے۔ منورما نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔ تب انہوں نے قریب آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ اس کا چہرہ دیکھ کر چونک پڑے۔ وہ مار گزیدوں کی طرح ٹکٹکی باندھے دیوار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا آنکھوں کے راستے جان نکل گئی ہو۔

راجہ صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔ نورا کیسی طبیعت ہے؟

اب منورما کو ہوش آیا۔ اُس نے راجہ صاحب کے کندھے پر سر رکھ دیا اور

اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ گویا جان ہی دے دیگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے منورما کو روتے دیکھا۔ عالم اضطراب میں بولے۔ بات کیا ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے۔ اِس گھر میں کِس کی اتنی مجال ہے۔ کہ تمہارے سامنے مُنہ کھول سکے۔ خون پی جاؤں۔ تم نے کچھ کہا ہے روہنی صاف صاف بتادو۔

روہنی پہلے تو منورما کی حالت دیکھکر سہم اُٹھی تھی۔ پر راجہ صاحب کے مُنہ سے خون پی جانے کی دھمکی سُنکر وہ برانگیختہ ہوگئی۔ جی میں تو آیا۔ کہدوں، ہاں میں نے کہا ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے حق ہی کہا ہے۔ جو کچھ کرنا ہو کرلو۔ خون پی کریں کھڑے نہ رہو گے۔ لیکن راجہ صاحب کی غضب ناک صورت دیکھ کر سہم گئی۔ بولی۔ انہیں سے کیوں نہیں پوچھتے۔ میری بات کا اعتبار ہی کیا۔

راجہ۔ نہیں، میں تم سے پوچھتا ہوں۔

روہنی۔ اُن سے پوچھتے کیا ڈر لگتا ہے؟

منورما نے سسکتے ہوئے کہا۔ اب میں یہاں رہوں گی۔ آپ جاکر میری سب چیزیں یہیں بھجوا دیجئے۔

راجہ۔ آخر بات کیا ہے۔ کچھ معلوم بھی تو ہو۔

منورما۔ بات کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اب یہیں رہونگی۔ آپ جائیں۔

راجہ صاحب سمجھ گئے۔ کہ روہنی نے ضرور کوئی زہر اُگلا ہے۔ اس کی طرف لال لال آنکھیں کرکے بولے۔ تمہارے کارن یہاں سے جان لیکر بھاگا۔ پھر بھی تمہیں تسکین نہیں۔ میری خوشی ہے۔ جس سے چاہتا ہوں بولتا ہوں۔ تمہیں اِس کی جلن کیوں ہوتی ہے۔

روہنی۔ جلن ہوگی۔ میری بلا کو۔ تم یہاں تھے ہی تو کیا کر دیا تھا۔ یہاں تو جیسے گنتا گھر ہے۔ ویسے ہے بدیس۔ تقدیر میں رونا لکھا ہے روتی ہوں۔

راجہ۔ ابھی تو نہیں روئیں۔ مگر شوق ہے تو رو دوگی۔

روہنی۔ جنہیں رونے کا شوق ہے وہ روئیں۔ یہاں آنکھیں پھوڑنی نہیں ہے۔

راجہ صاحب نے دانت پیسکر کہا۔ شرم وحیا چھو نہیں گئی۔ کنجڑنوں کو بھی مات کر دیا۔

روہنی۔ شرم وحیا والی تو ایک وہ ہیں جنہیں چھاتی سے لگائے کھڑے ہو۔ ہم گنواریں شرم اور حیا کیا جانیں۔

راجہ صاحب نے زمین پر پیر ٹپک کر کہا۔ اس کا نام مت لو۔ اپنا بتلائے دیتا ہوں۔ اُسے کوسا تو اچھا نہ ہوگا۔

روہنی۔ تم تو ایسی ڈانٹ بتاتے ہو۔ گویا میں کوئی لونڈی ہوں۔ کیوں نہ انکا نام لوں وہ سیتا اور ساوتری ہوں گی تو تمہارے لئے ہونگی۔ یہاں کیوں پردہ ڈالنے لگی۔ جو بات دیکھوں گی سنوں گی وہ کہوں گی بھی۔ کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔

راجہ صاحب کا غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ لیکن منورما کے سامنے وہ اپنی جبوائی صورت دکھاتے ڈرتے تھے۔ مگر اب اُن سے ضبط نہ ہوسکا۔ بولے تم جیسی عورت کو زہر کھاکر مر جانا چاہیئے۔ زندگی تلخ کر دی۔

روہنی نے شعلہ بار آنکھوں سے راجہ صاحب کو دیکھا۔ اور پاندان کو ٹھکراتی، لوٹے کا پانی گراتی وہاں سے چلی گئی۔

منورما نے تحمل کے ساتھ کہا۔ آپ ناحق انکے مُنہ لگے۔ میں آپ کے ساتھ نہ جاؤنگی۔

راجہ۔ نورا کبھی کبھی مجھے تمہارے اوپر بھی غصہ آتا ہے۔ اِن گنوارنوں کے ساتھ تمہیں زندگی کا کیا لطف آئے گا۔

راجہ صاحب بہت دیر تک سمجھاتے رہے۔ لیکن منورما نے ایک نہ مانی۔ روہنی کی باتیں ابھی تک اُس کے دِل کے ایک ایک ذرّے میں سلگ رہی تھیں۔ اُسے اندیشہ ہو رہا تھا۔ کہ مجھ سے یہ بدگمانی روہنی ہی کو نہیں ہے۔ یہاں سبھی کے دلوں میں میری طرف سے یہی سلوک ہونگے۔ روہنی محض اِس سوئے ظن کو ظاہر کردینے کی خطا وار ہے۔ اِس بدگمانی کا ازالہ یہاں سب کے ساتھ رہنے ہی سے ہو سکتا تھا۔ اور یہی اسکی ضد کا سبب تھا۔ آخر راجہ صاحب نے مایوس ہو کر کہا تو پھر میں بھی کاشی چھوڑے دیتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ اکیلے وہاں ایک دن مجھ سے نہ رہا جائے گا۔

منورما نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ جیسے آپکی مرضی۔

یکایک منشی بجر دھر لاٹھی ٹیکتے آتے دکھائی دیئے۔ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ پاجامے کا آزار بند نیچے لٹکتا ہوا۔ آنگن میں کھڑے ہو کر بولے۔ رانی منورما آپ کہاں ہیں۔ ذرا یہاں آئیے گا۔ یا حکم ہو تو میں ہی آؤں۔

راجہ صاحب نے چڑھ کر کہا کیا ہے۔ آپ کو اِس وقت یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ سب لوگ یہیں چلے آئے۔ کوئی وہاں بھی تو چاہیئے۔

منشی جی کمرے میں آکر بیکسانہ انداز سے بولے۔ کیا کروں حضور گھر تباہ ہوا جا رہا ہے حضور سے نہ روؤں تو کس سے روؤں۔ للّو نہ جانے کیا کر لینے پر آمادہ ہے۔

منورما نے خائف ہو کر کہا۔ کیا بات ہے منشی جی۔ ابھی تو آج بابوجی وہاں میرے پاس آئے تھے۔ کوئی نئی بات نہیں کہی۔

منشی۔ وہ اپنی بات کسی سے کہتا ہے۔ کہ آپ ہی سے کہے گا۔ مجھ سے بھی کچھ نہیں کہا۔ لیکن آج الہ آباد جانے کو تیار بیٹھا ہوا ہے۔ بہو کو بھی سے لئے جاتا ہے۔ کہتا ہے اب یہاں نہ رہوں گا۔

منورما۔ آپ نے پوچھا نہیں۔ کیوں جاتے ہو۔ ضرور کوئی بات ہوئی ہوگی۔

نہیں تو بہو کو لیکر نہ جاتے۔ بہوتے تو انکے کان نہیں بھر دیئے۔

منشی۔ نہیں حضور۔ وہ تو ساکشات لکشمی ہے۔ ایک مہینے سے زیادہ ہو گئے۔ پر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اپنی ساس کا بدن دبائے بغیر سوئی ہو۔ یہ سب للو کی شرارت ہے۔ اتنی خود پروری: جانے اس میں کہاں سے آگئی۔ مجھے تو کچھ سمجھتا ہی نہیں آگرے میں جاکر شادی کی۔ کتنا سمجھایا، نہ مانا۔ میں نے درگذر کیا۔ سوچا جب لڑکے سے اس کی شادی ہو گئی۔ تو اب اس کا دل کیوں دکھاؤں۔ لیکن للو کا منہ پھر بھی سیدھا نہیں ہوتا۔ اب نہ جانے کیا کرنے پر تلا ہوا ہے۔

منورما۔ گھر میں کسی نے طعنہ تو نہیں دیا؟

منشی۔ علم کی قسم کھاکر کہتا ہوں حضور! جو کسی نے چوں تک کی ہو۔ طعنے تو اُسے دیئے جاتے ہیں۔ جو اپنی حیثیت سے بڑھے۔ وہ تو سیوا اور پریم کی دیوی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہم دونوں آدمی اسکا چھُوا نہیں کھاتے۔

منورما۔ اچھا، یہ بات ہے۔ بھلا بابوجی یہ کب برداشت کرنے لگے۔ میں اہلیا کی جگہ ہوتی۔ تو اس گھر میں ایک لمحے بھر بھی نہ رہتی۔ وہ نہ جانے کیسے اتنے دنوں رہ گئی۔

منشی۔ اس نے تو کبھی زبان تک نہیں کھولا حضور۔ اسلئے تو میں نے اس کے آتے ہی اُتے ایک مہراجن رکھ لی جس میں چھُوت چھات کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔ مگر اتفاق کی بات ہے۔ کل وہ چوکے میں چلی گئی۔ چوکا چھُوت ہو گیا۔ للو نے تو کھانا کھایا اور ہم دونوں آدمیوں کے لئے بازار سے پوریاں آئیں۔ اتنی سی بات پر للو جامے سے باہر ہو گیا ہے۔

منورما نے افسردہ دلی سے کہا۔ تو میں کیا کر سکتی ہوں۔

منشی۔ آپ جو کچھ کر سکتی ہیں۔ دوسرا نہیں کر سکتا۔ ذرا چلکر اُسے سمجھا دیجئے

مجھ پر اتنا رحم کیجئے۔ ہمیشہ سے جو باتیں مانتے آتے ہیں۔ وہ اب نہیں چھوڑی جائیں۔

منورما۔ تو نہ چھوڑیئے۔ آپ کو کوئی مجبور نہیں کرتا۔ آپ کو اپنے رسوم پیاری ہیں اور ہونی چاہئے۔ تو انہیں بھی اپنی عزت پیاری ہے اور ہونی چاہئے۔ میں جیسے آپ کو مجبور نہیں کرسکتی۔ اسی طرح انہیں بھی مجبور نہیں کرسکتی۔ آپ جانیں اور وہ جانیں۔ مجھے بیچ میں نہ ڈالئے۔

منشی۔ رانی صاحب! اتنا مایوس نہ کیجئے۔ للو اگر چلا گیا تو ہم دونوں روتے روتے مر جائیں گے۔

منورما۔ تو اسکی کیا فکر۔ ایک دن تو سبھی کو مرنا ہے۔ یہاں بیٹھا کون رہیگا!

منشی۔ آپ تو جلے پر نمک چھڑک رہی ہیں۔ ہم نے بہو کی دلجوئی میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔ صرف اس کا چھوا نہ کھایا تو اس میں روٹھنے کی کیا بات ہے۔ ہم کتنی ہی باتوں میں دب گئے۔ تو کیا انہیں ایک بات میں بھی نہ دبنا چاہئے۔

منورما۔ تو مجبور کر دیا ہے نا۔ میرے پاس کیا دوڑے آئے ہیں۔ میری رائے اگر پوچھتے ہو تو جا کر چپکے سے بہو کے ہاتھ سے کھانا پکوا کر کھا لیجئے۔ دل سے یہ خیال نکال ڈالئے کہ وہ نیچی ہے اور آپ اونچے ہیں۔ اپنی تقدیر کو سراہئے کہ ایسی بہو پائی اور اگر چھوت چھات کا ڈھونگ کرنا ہے تو جا کر بیٹھئے۔ میں اس معاملے میں بابو جی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کچھ کہنا ہی نہیں چاہتی۔ وہ وہی کر رہے ہیں۔ جو انہیں کرنا چاہئے۔

منشی جی بڑی امیدیں باندھ کر دوڑے آئے تھے۔ یہ فیصلہ سنا تو کمر ٹوٹ گئی۔ سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگے اب کیا کروں۔ راجہ صاحب ابھی تک چپ چاپ ان

اِن دونوں آدمیوں کی باتیں سُن رہے تھے۔ اب اُنہیں اپنی داستانِ مصیبت کہنے کا موقع ملا۔ بولے۔ آپ کی بات تو طے ہوگئی۔ اب ذرا میری بھی سنیئے۔ یہاں نورا اور روہنی میں کسی بات پر جھڑپ ہوگئی۔ اس نے اُنہیں نہ جانے کیا کہدیا کہ اب کہہ رہی ہیں میں کاشی جاؤنگی ہی نہیں۔ کتنا سمجھا رہا ہوں۔ مانتی ہی نہیں۔

منشی۔ اِنہیں بھی تو للتہ ہی نے تعلیم دی ہے۔ نہ وہ کسی کی مانتا ہے۔ نہ یہ کسی کی مانتی ہیں۔

منورما نے مسکرا کر کہا۔ آپ کو ایک دیوی کی توہین کرنے کی سزا مِل رہی ہے۔

راجہ صاحب نے پُوچھا۔ اور مجھے۔؟

منورما نے منہ پھیر کر کہا۔ آپ کو بہت سی شادیاں کرنے کی۔

منورما یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ راجہ صاحب منشی کو لیئے ہوئے باہر آئے، سامنے والے باغ میں ایک بنچ پر جا بیٹھے اور بولے۔ منشی جی! آپ نے نورا کی باتیں سُنیں۔ کتنی میٹھی چٹکیاں لیتی ہے۔ اِس وقت اس نے کیسی پتے کی بات کہی ہے۔ میں نے سمجھا تھا۔ اب زندگی آرام سے گذرے گی۔ اِن چڑیلوں سے گلا چھُوٹ جائے گا۔ مگر نورا نے مجھے پھر اُسی بھنور میں ڈال دیا۔ یہاں رہکر میں بہت دِنوں زندہ نہیں رہ سکتا۔ روہنی مجھے زندہ نہ چھوڑے گی شاید اس کا بس ہوتا تو مجھے کھا جاتی۔ کوئی ایسی ترکیب نہیں نظر آتی کہ نورا کی تالیف قلب کر دوں۔

منشی۔ حضور! وہ خود بہت دنوں تک یہاں نہیں رہینگی۔ ان کا جی یہاں سے بہت جلد اُکتا جائے گا۔

راجہ۔ ایشور کرے آپ کی پیشین گوئی سچی ہو۔ آپ کو دیر ہو رہی ہو تو جایئے میری ڈاک وہاں سے برابر بھجواتے رہیے گا۔

آدھی رات سے زیادہ گذر چکی تھی۔ پر سورما کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ اس شاہی محل میں جو عیش اور تکلف کی چیزوں سے پُر تھا۔ اُسے اپنی زندگی ویران اور خشک نظر آرہی تھی۔ وہ ایک سنسان ہیبت ناک جنگل میں اکیلی کھڑی تھی۔ سامنے بہت دُور پر ایک چراغ جل رہا تھا۔ پر جیوں جیوں وہ چراغ کی طرف بڑھتی تھی، چراغ دُور تر ہوتا جاتا تھا۔ اُسنے منشی جی سے تو چکر دھر کو سمجھانے سے انکار کر دیا تھا۔ پر جیوں جیوں رات بھیگتی تھی۔ اس کا دل اُنہیں روکنے کے لیئے بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ کیسے جائیں گے۔ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لاؤنگی اگر اپنے گھر میں نہیں رہ سکتے تو میرے یہاں رہنے میں اُنہیں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ مگر نہایت سنگدل آدمی ہیں۔ آج میرے پاس اتنی دیر بیٹھے اپنی سمتی کا رونا رو رہے ہیں۔ چھوٹے مُنہ سے بھی نہ کہا۔ کہ میں پریاگ جا رہا ہوں۔

یہ سوچتے ہی اُسے خیال آیا۔ کہ چکر دھر بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ بیوی ساتھ، خالی ہاتھ، نئی جگہ، نہ کسی سے راہ نہ رسم، شرمیلے آدمی۔ انہیں پریاگ میں کتنی تکلیف ہوگی۔ میں نے بڑی غلطی کی۔ مجھے منشی جی کے ساتھ چلی جانا چاہیئے تھا شاید بابو جی میرا انتظار کر رہے ہوں۔

اُس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج گیا تھا۔ چھت کی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی چارپائی سے اُٹھ کر آنگن میں آئی۔ کیوں نہ اسیوقت چلوں۔ گھنٹے بھر میں پہونچ جاؤں گی۔ چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ ڈر کس بات کا۔ راجہ صاحب سو رہے ہیں۔ اُنہیں جگانا فضول ہے۔ سویرے تک میں لوٹ ہی آؤں گی۔

لیکن پھر خیال آیا۔ اس وقت جاؤں گی تو لوگ کیا کہیں گے۔ اتنی رات گئے سب کو جگانا کتنا بے موقع ہوگا۔ وہ پھر آکر لیٹ رہی۔ اور سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔ پانچ گھنٹے اِسی انتظار میں جاگتے رہنا غیر ممکن تھا۔ پچھلے پہر اُسے

نیند آگئی۔ اس وقت شاید فکر بھی تھک کر سو جاتی ہے۔ لیکن دیر سے سونے پر بھی منورما کو اٹھنے میں دیر نہ لگی۔ ابھی سب لوگ سوتے ہی تھے۔ کہ وہ اُٹھ بیٹھی اور اپنا ہینڈ بیگ لیکر روانہ ہوگئی۔

چکردھر بھی علی الصبح اٹھے اور چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انہیں ماں باپ کو چھوڑ کر جانا بہت شاق گذر رہا تھا۔ پر اس گھر میں اہلیا کی جو حالت تھی۔ وہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اہلیا نے کبھی شکایت نہ کی تھی۔ وہ چکردھر کے ساتھ سب کچھ جھیلنے کو تیار تھی۔ لیکن چکردھر کو یہ کس طرح گوارا نہ تھا۔ کہ اہلیا ان کے گھر میں پرائی بن کر رہے۔ والدین سے بھی کچھ کہنا سننا انہیں بیکار معلوم ہوتا تھا۔ مگر ان کے یہاں سے جانے کا صرف یہی ایک سبب نہ تھا۔ ایک سبب اور بھی تھا۔ جسے وہ پوشیدہ ہی رکھنا چاہتے تھے۔ جس کی اہلیا کو کچھ خبر نہ تھی۔ آجکل منورما دن میں ایک بار ان کے پاس ضرور آجاتی۔ اگر خود نہ آسکتی تو انہیں بلا بھیجتی تھی۔ اس کے روبرو آکر چکردھر کو اپنا ضبط، اپنی تمیز، اور سکون قلب بالو کی ممنڈ کیطرح کھسکتے معلوم ہوتے۔ راہ فرار اختیار کرنے ہی میں اپنی عافیت نظر آتی تھی۔ وہ اپنی کتابیں وغیرہ نکال ہی رہے تھے۔ کہ منورما کی موٹر آتی ہوئی دکھائی دی۔ چکردھر مارے شرم کے گڑ گئے۔ وہ اسکے آنے کے پہلے ہی روانہ ہو جانا چاہتے تھے۔

منورما نے موٹر سے اترتے ہی کہا۔ بابو جی ابھی ذرا ٹھہر جائیے۔ اتنی عجلت کیا ہے۔ آپ تو ایسا بھاگے جا رہے ہیں گویا روٹھے جا رہے ہوں۔ بات کیا ہے معلوم بھی تو ہو۔

چکردھر نے کتابوں کا بقچہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ بات کچھ نہیں ہے۔ یوں ہی ذرا الہ آباد رہنے کا ارادہ ہے۔ زندگی بھر والدین کا دست نگر رہنا تو مناسب نہیں۔

منورما۔ وہاں کیا کرنے کا قصد ہے ؟

چکردھر۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی ۔

منورما۔ جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے گا۔ کیوں اور کس ارادے سے جا رہے ہیں میں آپ کو نہ جانے دونگی ۔

چکردھر۔ میں دس پانچ دن کے بعد آکر آپ سے سارا واقعہ بیان کروں گا۔ اِس وقت گاڑی چھوٹ جائے گی۔ میرے احباب مجھے اسٹیشن پر لینے آئینگے۔

منورما۔ میں نے کہدیا آپ اس گاڑی نہیں جا سکتے۔

چکردھر۔ آپ کو ساری کیفیت معلوم ہوتی تو آپ کبھی مجھے روکنے کی کوشش نہ کرتیں۔ آدمی مجبور ہو کر ہی اپنا گھر چھوڑتا ہے۔ میرے لئے اب یہاں رہنا غیر ممکن ہو گیا ہے۔

منورما۔ تو کیا یہاں کوئی دوسرا مکان نہیں مل سکتا۔ ؟

چکردھر۔ مگر ایک ہی جگہ والدین سے الگ رہنا کتنا بھدا معلوم ہوتا ہے۔

منورما۔ آپ سمجھتے ہوں گے۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ مگر مجھے آپکے گھر کی حالت تھوڑی بہت معلوم ہے۔ کیوں نہ اہلیا کو کچھ دنوں کے لئے میرے ساتھ رہنے دیجئے۔ میں نے اب جگدیشپور میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ بھی وہاں رہ سکتے ہیں۔ میری بہت دنوں سے آرزو ہے کہ کچھ دنوں آپ میرے مہمان ہوں۔ مہمان کیوں ہوں۔ وہ بھی تو آپ ہی کا گھر ہے۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج میری اتنی بات مان لیجئے۔ میں ذرا گھر میں جاتی ہوں۔ یہ بستر وغیرہ کھولکر رکھ دیجئے۔ یہ سب سامان دیکھ کر میرا دل نہ جانے کیسا ہوا جاتا ہے۔

چکردھر۔ نہیں منورما، مجھے جانے دو۔

منورما۔ آپ نہ مانیں گے ؟

چکردھر۔ یہ بات نہ مانوں گا۔

منورما۔ مجھے روتے دیکھ کر بھی۔؟

منورما کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ چکردھر کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ بولے۔ منورما، مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد لوٹ آؤں گا۔

منورما۔ اچھی بات ہے جائیے۔ لیکن میری یہ نذر قبول کیجئے۔

اُس نے اپنا ہینڈ بیگ چکردھر کی طرف بڑھایا۔ چکردھر نے پوچھا۔ اس میں کیا ہے؟

"کچھ بھی ہو"

"اگر نہ لوں تو"

تو میں اپنے ہاتھوں سے آپ کا بوریا بندھنا اٹھا کر گھر میں رکھ آؤں گی۔

چکردھر نے مسکرا کر کہا۔ آپ کو اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑے گی۔ میں اسے لئے لیتا ہوں۔ شاید وہاں بھی مجھے کام کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس بیگ کا وزن ہی بتلا رہا ہے۔

تانگا آگیا۔ چکردھر اور اہلیا اس پر جا بیٹھے۔ گھر کے باقی تینوں آدمی دروازے پر کھڑے روتے رہ گئے ۔

(۳۰)

قومی خدمت کرنے کے لئے کہیں بھی موقع کی کمی نہیں۔ صرف دل میں ایثار کا جذبہ ہونا چاہیئے۔ چکردھر الہ آباد میں اچھی طرح جمنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ چاروں طرف سے انکے لئے کھینچ تان ہونے لگی۔ اُن میں قوم کی محبت تھی! خدمت کا جوش تھا اور تنظیم کی قابلیت تھی۔ سارے شہر میں ایک بھی ایسا آدمی

نہ تھا۔ جو ان کی طرح بے غرض ہو۔ اور لوگ قومی خدمت کو ایک ضمنی کام سمجھتے تھے کسب زر ان کی اصلی غرض تھی۔ چکردھر کے لئے اس کام کے سوا اور کوئی فکر نہ تھی۔ انہوں نے مضافات شہر میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ اور بڑی کفایت سے گذر کرتے تھے۔ آگرے میں اُنہیں جتنے روپے ملے تھے۔ وہ سب منشی بجر دھر کے نذر ہو گئے تھے۔ وہاں روپے کی ہمیشہ قلت رہتی تھی۔ کم ملنے پر کم قلت رہتی تھی۔ کیونکہ ضرورتیں گھٹالی جاتی تھیں۔ زیادہ ملنے پر زیادہ قلت رہتی تھی۔ کیونکہ ضرورتیں بڑھا بھی لی جاتی تھیں۔ چکردھر کو اب محسوس ہونے لگا تھا۔ کہ خانہ داری میں پڑکر کچھ نہ کچھ مستقل آمدنی کی ضرورت ہے۔ اپنے لئے تو اُنہیں کوئی فکر نہ تھی۔ لیکن اہلیا کو وہ افلاس کی آزمائش میں نہ ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ اب اکثر متفکر دکھائی دیتی تھی۔ یوں تو وہ کبھی شکایت نہ کرتی پر اسکے بشرے سے صاف نظر آتا تھا کہ وہ اپنی حالت پر قانع نہیں ہے۔ وہ تکلفات کی دلدادہ نہ تھی، نہ سیر تماشے کا ہی اُسے چسکا تھا۔ مگر ضروریات کی تکلیف اُس سے نہ برداشت ہوتی تھی۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق تھا وہ ہر ایک تکلیف جھیلنے کو طیار تھی۔ مگر چکردھر کو اس حالت میں دیکھ کر اُسے رنج ہوتا تھا۔ جب اور لوگ پہلے اپنے گھر میں چراغ جلاکر مسجد میں چراغ جلاتے ہیں تو وہی کیوں اپنے گھر کو اندھیرا چھوڑ کر مسجد میں چراغ جلائیں۔ اور ان کو اگر بنگلہ اور موٹر چاہئے تو کیا اسکے لئے صاف ستھرا مکان بھی نہ ہو۔ سواری کے لئے پیر گاڑی بھی نہ ہو۔ دوسرے ثروت اور جائداد پیدا کرتے ہیں تو کیا یہاں روٹیوں کے بھی لالے ہوں۔ اگر اس نفس کشی کے عوض چکردھر کو نیکنامی کا بڑا حصہ ملتا تو شاید اہلیا کے آنسو پونچھ جاتے۔ لیکن جب اوروں کو وہ بغیر اتنی قربانیاں کئے چکردھر سے زیادہ شہرت اور عزت پاتے دیکھتی تھی تو اُسے ضبط نہ ہوتا

تھا۔ عوام امیروں کی جتنی عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ اتنی خالص خادموں کی نہیں جوشِ خدمت کے ساتھ اُسے دولت کی بھی ضرورت معلوم ہوتی تھی۔ اہلیا کو چکردھر کی یہ بے نفسی اسی لئے بڑی معلوم ہوتی تھی۔ خدمت خود اپنا صلہ ہے۔ یہ اعلےٰ معیار اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

اگرچہ چکردھر کو اپنی ہی خانہ داری کا بار سنبھالنا ہوتا تو شاید اُنہیں زیادہ تکلیف نہ ہوتی۔ کیونکہ انکے مضامین بہت مقبول ہوتے تھے اور دو تین رسالوں میں لکھ کر وہ اپنی گذران کے لئے کافی پیدا کر لیتے تھے۔ مگر منشی بجر دھر کے تقاضوں کے مارے ان کا ناک میں دم تھا۔ منورما جگدیش پور میں جاکر گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ ریاست کے معاملات میں بالکل دخل نہ دیتی۔ شاید اُسے دولت ہی سے نفرت ہو گئی تھی اسلئے اب منشی جی کو صرف تنخواہ ہی پر گذر کرنا پڑتا تھا۔ چکردھر کو بار بار تنگ کرتے اُنہیں مجبور ہو کر باپ کی امداد کرنی پڑتی تھی۔

اگہن کا مہینہ تھا۔ خاصی سردی پڑ رہی تھی۔ مگر ابھی تک چکردھر جاڑوں کے کپڑے نہ بنوا پائے تھے۔ وہ اسی فکر میں تھے کہ کہیں سے روپے آ جائیں۔ تو ایک کمبل لے لوں۔ آج بڑے انتظار کے بعد لکھنؤ کے ایک ماہوار رسالے کے دفتر سے پچیس روپے کا منی آرڈر آیا تھا۔ اور وہ اہلیا کے پاس بیٹھے ہوئے کپڑوں کا پروگرام بنا رہے تھے۔

اہلیا نے کہا۔ مجھے ابھی کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے لئے کوئی اچھا سا کمبل پندرہ روپے میں لے لو۔ باقی روپیوں میں اپنے لئے ایک اونی کرتہ بنوا لو۔ اور نئے جوتے لے لو۔

چکردھر۔ میرے لائق تین چار روپے میں اچھا کمبل آ جائے گا۔ باقی روپیوں میں تمہارے لئے ایک الوان لائے دیتا ہوں۔ سویرے سویرے اٹھ کر تمہیں کام کاج

کرنا پڑتا ہے کہیں سردی کھا جاؤ تو مشکل پڑے۔ اونی کرتے کی کوئی ضرورت نہیں میں تگڑا آدمی ہوں۔ سردی برداشت کر سکتا ہوں۔

اہلیا۔ خوب تگڑے ہو کیا کہنا ہے۔ ذرا آئینے میں جاکر صورت تو دیکھو۔ جب سے یہاں آئے ہو، صورت ہی بدل گئی۔ میں جانتی کہ یہاں آکر تمہاری یہ حالت ہوگی۔ تو گھر سے قدم نہ نکالتی۔ میں الوان سلوان نہ لوں گی۔ تم محض اپنے لئے ایک کمبل لاؤ۔ نہیں میں سچ کہتی ہوں۔ اگر مجھے دق کروگے تو میں گھر سے چلی جاؤں گی

چکردھر۔ تمہاری یہی ضد مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں کئی سال سے اپنے کو اسی قسم کی زندگی کا عادی بنا رہا ہوں۔ دبلا ہوں تو کیا گرمی سردی خوب سہہ سکتا ہوں۔ تمہیں یہاں آئے نو دس مہینے ہوتے۔ بتاؤ میرے سر میں ایک دن بھی درد ہوا؟

ڈاکیے نے پکارا خط لے جایئے۔

چکردھر نے جاکر خط لے لیا۔ اور اسے پڑھتے ہوئے اندر آئے اور مایوسانہ انداز سے بولے۔ میرے آتے ہی گھر والوں پر کچھ ایسی ساڑھے ساتی سوار ہو گئی ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک دن مصیبت گھیرے ہی رہتی ہے۔ ابھی منگلا بیمار تھی۔ اب اماں بیمار ہیں۔ بابو جی کو بھی کھانسی آرہی ہے۔ آجکل بالائی آمدنی کچھ نہیں ہوتی۔ لکھا ہے پچاس روپے بھیجدو۔

اہلیا نے پوچھا۔ اماں جی بہت بیمار ہیں؟

"ہاں لکھا تو ہے"

"تو جاکر انہیں دیکھ ہی کیوں نہ آؤ"

"تمہیں اکیلا چھوڑکر"؟

"ڈر کیا ہے"

"چلو..."

"اچھا تو مجھی کو پہونچا دو"

"ہم اور تم دونوں کیوں نہ چلیں"

اہلیا نے کہا۔ جی نہیں معاف کیجئے۔ آپ وہاں بھی میری جان کھائیں گے۔ اور بیچاری اماں کو رُلائینگے۔

چکردھر نے بے دردی کے ساتھ کہا۔ بہانہ ہے سراسر بہانہ۔ ناحق مجھے تنگ کرتے ہیں۔

اہلیا۔ بہانہ ہو یا سچ ہو۔ روپے تو بھیجنے ہی پڑیں گے۔ روپے بھیجدو۔ باقی کے لئے لکھدو۔ کوئی فکر کرکے جلدی بھیجوں گا۔ تمہاری تقدیر میں امسال جڑا اور نہیں لکھا ہے۔

چکردھر۔ لکھے دیتا ہوں۔ میں خود تنگ ہوں۔ آپ کے پاس کہاں سے بھیجوں۔

اہلیا۔ اے ہٹو بھی۔ بھلا وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

چکردھر کچھ دیر تک تو سکون کے عالم میں بیٹھے رہے۔ پھر معذرت آمیز لہجہ میں بولے۔ کسی سے قرض لینا پڑے گا اور کیا۔

اہلیا۔ نہیں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ قرض نہ لینا۔ اس سے تو انکار کردینا ہی اچھا۔

چکردھر۔ ایک ایسے مہاجن سے لوں گا جو تقاضے نہ کرے گا۔

اہلیا۔ ایسا کون مہاجن ہے بھئی۔ یہیں رہتا ہے؟ کوئی دوست ہوگا۔ دوست سے تو قرض لینا ہی نہ چاہیئے۔ اس سے تو مہاجن کہیں اچھا۔ کون ہے ذرا اسکا نام سنوں۔

چکردھر ایک پرانا دوست ہے جس نے مجھ سے کہہ رکھا ہے۔ کہ تمہیں روپے کی جس وقت ضرورت سخت پڑے۔ مجھ سے لے لینا۔ پھر جب جی چاہے دے دینا۔

اہلیا۔ کون ہے، بتاؤ۔ تمہیں میری قسم۔

چکردھر۔ تم نے قسم رکھا دی۔ اس نے مجھے بہت مشکل میں ڈال دیا۔ وہ دوست رانی منورما ہیں۔ انہوں نے مجھے گھر سے چلتے وقت ایک چھوٹا سا بیگ دیا تھا میں نے اس وقت تو کھولا نہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر کھولا۔ تو اس میں پانچ ہزار روپے نکلے۔ سب روپے جیوں کے تیوں رکھے ہیں۔

اہلیا۔ کبھی اُس میں سے نکالا تو نہیں۔؟

چکردھر۔ کبھی نہیں۔ یہ پہلا ہی موقع ہے۔

اہلیا۔ تو بھول کر بھی نہ نکالنا۔

چکردھر۔ واوا زندہ نہ چھوڑیں گے۔

اہلیا۔ ان سے صاف کہدو۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔ رانی جی کی امانت کسی موقع سے لوٹانی ہوگی۔ امیروں کا احسان کبھی نہ لینا چاہیئے۔ کبھی کبھی اسکے عوض میں اپنے ضمیر کا خون کرنا پڑتا ہے۔ رانی منورما تو ہمیں بھول ہی گئیں۔ ایک خط بھی نہ لکھا۔

چکردھر۔ آجکل اُنہیں اپنے گھر کے جھگڑوں ہی سے نہ فرصت ملتی ہوگی۔

اہلیا۔ یہ روپے لالہ جی کے پاس بھیجدو۔ تب تک اور سردی کا مزہ اٹھالو۔

اہلیا بڑی رات تک اسی فکر میں مبتلا رہی کہ جڑاور کا کیا انتظام ہو چکردھر نے قومی خدمت کا اتنا بھاری بوجھ اپنے سر لے لیا تھا کہ ان سے زیادہ فارغ البال ہونے کی امید نہ کیجا سکتی تھی۔ بڑی مشکلوں سے رات کا تھوڑا وقت نکال کر

بیچارے کچھ لکھ پڑھ لیتے تھے۔ زیادہ دولت پیدا کرنے کے لیے اُنہیں مجبور کرنا ان پر ظلم کرنا تھا۔ سوچنے لگی، میں کچھ کام کر سکتی ہوں یا نہیں۔ سلائی اور بوٹے کا کام وہ خوب کر سکتی تھی۔ مگر جگر دھر کو یہ کب منظور ہو سکتا تھا کہ وہ پیسے کے لیے دیدہ ریزی کرے۔ ایک دن اُس نے ایک ماہوار رسالے میں اپنی ایک سہیلی کا مضمون دیکھا۔ دونوں آگرے میں ساتھ ساتھ پڑھتی تھیں۔ اہلیا ہمیشہ اُس سے اچھے نمبر پاتی تھی۔ یہ مضمون پڑھ کر اہلیا کی وہی حالت ہوئی جو کسی اصیل گھوڑے کی چابک پڑنے پر ہوتی ہے۔ وہ قلم لے کر بیٹھ گئی اور اُسی مضمون پر تنقید کرنے لگی۔ وہ اتنی تیزی سے لکھ رہی تھی۔ گویا بھاگتے ہوئے خیالات کو سمیٹ رہی ہو۔ الفاظ اور جملے آپ ہی آپ نکلتے چلے جاتے تھے۔ اپنے ذہن میں ایسی آمد کا اُسے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ آدھ گھنٹے میں اُس نے چار پانچ صفحے لکھ ڈالے جب اُس نے اپنی تنقید پر نظر ثانی کی تو اُسے معلوم ہوا کہ میرا مضمون سہیلی کے مضمون سے کہیں اچھا ہے۔ تاہم اُسے ایڈیٹر کے پاس بھیجتے ہوئے اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں نامنظور نہ ہو جائے۔ اُس نے دونوں مضامین کا دو دن بعد روانہ کیا۔ اور آخر تیسرے دن اُسے بھیج ہی دیا۔ تیسرے دن جواب آگیا۔ تنقید منظور کر لی گئی تھی اور جلد ہی معاوضہ بھیجنے کا وعدہ تھا۔ کئی دنوں کے بعد ایک رجسٹری لفافہ سے دس روپے کا ایک نوٹ آ پہونچا۔ اہلیا پھولی نہ سمائی۔ اُسے اِس خیال سے اطمینان بخش غرور ہوا کہ خانہ داری میں میں بھی کچھ مدد کر سکتی ہوں اُسی دن اُس نے ایک دوسرا مضمون لکھنا شروع کیا۔ اور دو تین دن میں اُسے ختم کر کے بھیجدیا۔

پوس کا مہینہ آگیا ہے۔ زوروں کی سردی پڑنے لگی ہے۔ نہاتے وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کاٹ کھائے گا۔ پر ابھی تک جگر دھر جڑاور نہ بنوا سکے

ایک دن بادل ہو آئے اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ چکر دھر دس بجے رات کو ایک جلسے سے لوٹے تو مارے سردی کے کلیجہ کانپ اٹھا۔ چال تیز کی۔ مگر سردی کم نہ ہوئی۔ تب دوڑنے لگے۔ گھر کے قریب پہونچکر رُک گئے۔ سوچا، ابھی سے یہ حال ہے تو رات کیسے کٹے گی۔ اور میں تو کسی طرح کاٹ بھی لوں گا۔ اہلیا کا کیا حال ہوگا۔ اس بے چاری کو میرے باعث بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ میرے ساتھ شادی اسکے لئے سزا ہو گئی کل سب سے پہلے کپڑوں کی فکر کروں گا۔ یہ سوچتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا، اہلیا انگیٹھی میں کوئلہ بھرے بیٹھی تاپ رہی ہے آج وہ بہت خوش نظر آتی ہے۔ رات کو عموماً وہ روٹی اور کوئی سبزی کھایا کرتے تھے آج اہلیا نے پوریاں پکائی تھیں۔ اور سالن بھی کئی قسم کے تھے۔ کھانا کھا کر لیٹے تو دیکھا چارپائی پر ایک بہت اچھا کمبل پڑا ہوا ہے۔ تعجب سے پوچھا۔ یہ کمبل کہاں تھا۔

اہلیا نے مسکرا کر کہا۔ میرے پاس ہی رکھا تھا پسند ہے نا؟

چکر دھر۔ تمہارے پاس کمبل کہاں تھا۔ سچ بتاؤ کہاں ملا۔ بیس روپے سے کم کا نہ ہوگا۔

"تم مانتے ہی نہیں تو کیا کروں"

"مول لیا ہوگا۔ سچ بتاؤ۔ روپے کہاں تھے؟"

"تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے۔ یا پیڑ گننے سے"

"جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ آم کہاں سے آئے۔ میں تو انہیں ہاتھ بھی نہ لگاؤں"

"میں نے کچھ روپے بچا رکھے تھے آج کمبل منگوا لیا۔"

"میں نے تمہیں اتنے روپے کب دیئے کہ خرچ سے بچ جاتے"

"میں تھوڑا تھوڑا بچاتی گئی تھی۔"

"میں یہ ماننے کا نہیں۔ بتاؤ روپے کہاں ملے۔"

"بتا ہی دوں۔ اب کے میں نے ادیب کو دو مضمون بھیجے تھے۔ اُسی کے معاوضہ میں تیس روپے ملے تھے۔"

اہلیا نے سمجھا تھا کہ چکردھر یہ خبر سُنتے ہی خوشی سے اچھل پڑیں گے اور فرطِ مسرت سے مجھے گلے لگالیں گے۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ چکردھر نے دِل گرفتہ ہوکر کہا۔ کہاں ہے ادیب ذرا تمہارے مضامین دیکھوں۔

اہلیا نے دونوں نمبر لاکر ان کو دیدیئے اور شرما کر بولی۔ کچھ ہے نہیں اوٹ پٹانگ جو کچھ جی میں آیا لکھ دیا۔

چکردھر نے سرسری نگاہ سے مضامین کو دیکھا۔ ایسی چُست عبارت وہ خود نہ لکھ سکتے تھے۔ خیالات بھی دقیق اور سلجھے ہوئے تھے۔ اگر اہلیا نے خود نہ بتایا ہوتا تو وہ مضامین پر اس کا نام دیکھ کر بھی سمجھتے کہ اِس نام کی کوئی اور خاتون ہوگی۔ انہیں گمان بھی نہ تھا کہ اہلیا اِس قدر بلند خیال ہے۔ مگر یہ جان کر بھی وہ خوش نہ ہوئے۔ ان کے جذبۂ خودداری کو ایک چوٹ سی لگی۔ ان کے دِل میں گھر کے مالک ہونے کا جو غرور چُھپا ہوا بیٹھا تھا وہ چُور چُور ہوگیا۔ وہ نادانستہ طور پر عقل میں، علم میں، تجربہ میں اپنے کو اہلیا میں فایق سمجھتے تھے۔ کسبِ معاش ان کا حق تھا۔ آج وہ حق ان کے ہاتھ سے چھن گیا۔ شرمندہ ہوکر بولے۔ تمہارے مضامین بہت اچھے ہیں اور پہلی ہی کوشش میں تمہیں معاوضہ بھی مل گیا۔ یہ اور بھی خوشی کی بات ہے۔ لیکن مجھے تو کمبل کی ضرورت نہ تھی۔ کم سے کم میں اتنا قیمتی کمبل نہ چاہتا تھا۔ اِسے تمہیں اوڑھو۔ آخر تمہارے پاس بھی تو وہی ایک پرانی چادر ہے۔ میں اپنے لئے دوسرا کمبل لے لوں گا۔

اہلیا ان کے دل کی کیفیت سمجھ گئی، بولی۔ میں نے معاوضہ کے خیال سے تو مضامین نہ لکھے تھے۔ اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو اب نہ لکھوں گی۔

چکردھر۔ نہیں، نہیں، میں تمہیں لکھنے سے منع نہیں کرتا۔ تم شوق سے لکھو۔ مگر میرے لئے تمہیں یہ تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے عیش کرنا ہو تو اس کوچہ میں قدم ہی کیوں رکھتا۔ میں سب کچھ سوچ سمجھ کر ادھر آیا ہوں۔ مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ خدا اور دنیائے دوں، دونوں ساتھ نہیں ملتے۔ مجھے خدا سے منہ موڑ کر دنیائے دوں کی عبادت کرنی پڑے گی۔

اہلیا نے دردناک لہجہ میں کہا۔ میں نے تو تم سے کسی بات کی شکایت نہیں کی۔ تم جو کچھ ہو وہ نہ ہو کر اگر دولت مند ہوتے تو شاید میں اب تک کنواری ہی رہتی۔ دولت کی تمنا مجھے نہ تب تھی نہ اب ہے۔ میں نے صرف یہ خیال کیا کہ جب میں نے محنت کی ہے تو اس کی مزدوری لے لینے میں کیا ہرج ہے۔ یہ کمل تو کوئی شال نہیں ہے۔ جسے اوڑھنے میں تم کو شرم آئے۔ میرے لئے چادر کافی ہے۔ تمہیں جب روپے ملیں تو میرے لئے ایک لحاف بنوا دینا۔

کمل جیوں کا تیوں تہہ کیا ہوا رات بھر پڑا رہا۔ سردی کے مارے چکردھر کو نیند نہ آئی تھی۔ کمل میں ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس کا ایک ایک ریشہ انکے جسم میں تیر کی طرح چبھتا تھا۔ ایک بار انہوں نے اہلیا کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ پاؤں سمیٹے چادر سر سے اوڑھے گٹھڑی بنی پڑی ہوئی تھی۔ پر ان کی ہمت نہ پڑی وہ کمل اُسے اوڑھا دیں۔ اہلیا کی دلِ شکنی کا خیال مانع ہوتا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر ان کا ضمیر اُنہیں نفرین کرنے لگا۔ جب تم اس عورت کی ضروریات پوری نہیں کر سکتے۔ جو تمہارے اوپر اپنی جان تک نثار کر سکتی ہے۔ تو تم قوم کی خدمت کیا کرو گے۔ ترک اور خبط میں مشرقین کا تفاوت ہے۔ چکردھر بیتاب ہو کر

چاروں طرف نگاہ دوڑانے لگے کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جو اسے اوڑھا سکوں لیکن پُرانی دھوتیوں کے سوا کوئی چیز نہ نظر آئی۔ انہیں اس وقت دلدوز روحانی خلش ہو رہی تھی۔ جس غربت کا انہوں نے دامن پکڑا تھا۔ وہ اس وقت انہیں شرمناک معلوم ہوتی تھی۔

دفعتاً اہلیا نے آنکھیں کھول دیں اور بولی۔ تم کھڑے کیا کر رہے ہو؟ میں ابھی خواب دیکھ رہی تھی کہ ایک دیو ندی کے گہرے پانی میں مجھے ڈبلئے دیتا ہے۔ ابھی تک چھاتی دھڑک رہی ہے۔

چکردھر نے نادم ہو کر کہا۔ وہ دیو میں ہی ہوں اہلیا! میرے ہی ہاتھوں تمہیں مصیبتیں سہنی پڑ رہی ہیں۔

اہلیا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر چارپائی پر بٹھا دیا اور وہی کمل اوڑھاتی ہوئی بولی۔ تم میرے دیوتا ہو جس نے مجھے منجدھار سے نکالا ہے۔ دیو میرا نفس ہے جو مجھے ڈبانے کے لئے آمادہ ہے۔

ایک مرغ نے بانگ دی۔ چکردھر نے دروازہ کھول کر دیکھا تو نور سحر کی دیوی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ وہ اسی وقت اُٹھ بیٹھے اور کچھ کہنے لگے۔ صبح کو بھی وہ کہیں باہر نہ گئے۔ ناشتہ کر کے پھر لکھنے لگے۔ شام کو انہیں کماسبھا میں ایک تقریر کرنی تھی۔ پر وہ اس جلسہ میں بھی نہ گئے۔ اب ان کا یہی دستور ہو گیا کہ اپنے وقت کا بڑا حصہ تصنیف میں صرف کرتے۔ اب وہ خدمت کے بندے نہیں، نفس کے بندے تھے یعنی المعین کے ساتھ زندگی کے اصول بھی تبدیل ہو گئے اب اُن کی غایت حق کی تلاش اور علم کی اشاعت نہ رہی۔ وہ کسب زر کا وسیلہ بن گئی۔ اس مکان میں اب اُنہیں تکلیف ہونے لگی۔ دوسرا مکان لیا جس میں بجلی کے پنکھے اور روشنی تھی۔ ان نئی آسائشوں سے اُنہیں تصنیف میں اور بھی

آسانی ہو گئی۔ اس مکان میں مچھروں کے مارے کوئی دماغی کام نہ کر سکتے تھے۔ گرمی میں تو اس نیچے سے آنگن میں بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ کام کرنے کا ذکر ہی کیا۔ اب وہ کھلے ہوئے چھت پر بجلی کے پنکھے کے سامنے شام ہی سے بیٹھ کر کام کرنے لگتے تھے۔ اہلیا خود تو کچھ نہ لکھتی مگر چکر دھر کی کچھ امداد کر دیتی تھی۔ مضامین کا صاف کرنا۔ دوسری کتابوں اور اخباروں سے کارآمد مضامین کی نقل کرنا اُس کا کام تھا۔ پہلے اُس کی کھیتی کرتے تھے۔ جہاں دولت تھی نہ شہرت۔ وہ اوسر اب گلزار بن گیا تھا۔ اب رسالوں کے ایڈیٹران سے تقاضے کر کے مضامین لکھواتے لوگ ان مضامین کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ فلسفہ سے انہیں الفت تھی۔ ان کے مضامین بھی فلسفیانہ ہوتے تھے۔

لیکن چکر دھر کو اپنی کامیابیوں پر غرور نہ ہوتا تھا۔ اُنہیں کافی دولت ملتی تھی۔ غربت کم نہ تھی۔ لیکن خدمت کے کاموں میں اُنہیں جو اطمینان اور سکون حاصل ہوتا تھا وہ اب میسر نہ تھا۔ اپنے بدنصیب خستہ حال بھائیوں کی خدمت کرنے میں جو افتخار آمیز مسرت ہوتی تھی۔ وہ اب مہا ذلت جماعت کی دعوتوں میں نہ ہوتی تھی۔ مگر اہلیا خوش تھی۔ وہ اب بھولی بھالی نازنین نہ تھی۔ معاملہ فہم اور بیدار مغز عورت تھی۔ خانہ داری میں مشاق، فراخ دل، نیک مزاج اور اصولوں کی پابند۔ مجال نہ تھی کہ کوئی عورت اس کی آنکھ بچا کر ایک پیسہ بھی کھا جائے۔ ایشور نے ایک گلعذار بچہ بھی دے دیا۔ زندگی پُر بہار ہو گئی۔

اس طرح پانچ سال گذر گئے۔

ایک دن کاشی سے راجہ بشال سنگھ کا تار آیا، رانی منورما بہت بیمار ہیں فوراً آئیے۔ بچنے کی کم امید ہے۔ چکر دھر کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر گر پڑا۔ اہلیا سنبھال نہ لیتی تو شاید وہ خود گر پڑتے۔ آنکھوں کے سامنے تتلیاں سی اڑنے لگیں۔ ایک

لمحہ کے بعد ذرا سنبھلکر بولے ۔میرا بستر باندھ دو۔میں اسی گاڑی سے جاؤں گا۔

اہلیا۔ یہ ہو کیا گیا۔ ابھی تو دادا نے لکھا تھا کہ سب خیر و عافیت ہے۔

چکر دھر۔ کیا بتلاؤں ۔ کچھ نہیں یہ سب گھر کی نا اتفاقی کا نتیجہ ہے۔ منورما نے راجہ صاحب سے شادی کر کے سخت غلطی کی۔ سوتنوں نے اس کی زندگی وبال کر دی ہوگی۔

اہلیا۔ ہم لوگوں کے یہاں چلے آنے سے شاید ناراض ہو گئیں۔ کبھی ایک خط بھی نہ لکھا۔

چکر دھر۔ انکی تمنا تھی کہ ہم سب انکے ساتھ رہیں۔

اہلیا۔ کہو تو میں بھی چلوں۔ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی شفقت اور نوازش کبھی نہ بھولے گی۔

چکر دھر۔ جوگیندر بابو کو ساتھ لیتے چلیں۔ اُن سے زیادہ حاذق تو یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔

اہلیا۔ ہاں! اچھا تو ہوگا۔ بے لوث آدمی ہیں۔

چکر دھر۔ مگر تم میرے ساتھ لوٹ نہ سکو گی یہ سمجھ لو۔ منورما تمہیں اتنی جلد نہ آنے دیں گی۔

اہلیا۔ وہ اچھی تو ہو جائیں۔ لوٹنے کی بات پیچھے دیکھی جائے گی۔

دس بجتے بجتے یہ لوگ یہاں سے ڈاک پر چلے۔ اہلیا کھڑکی سے برسات کا دلفریب منظر دیکھ رہی تھی۔ چکر دھر بے تاب ہو کر گھڑی دیکھتے تھے کہ پہونچنے میں کتنی دیر ہے۔ اور منو کھڑکی سے باہر کود پڑنے کے لئے زور مار رہا تھا ؎

(۲۱)

چکردھر جگدیش پور پہونچے تو رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ محل کے دروازے پر غریبوں کو خیرات تقسیم کی جا رہی تھی۔ کنگلے ایک پر ایک ٹوٹے پڑتے تھے۔ سپاہی دھکے پر دھکے دیتے تھے۔ مگر کنگلوں کا ریلا کم نہ ہوتا تھا۔ منشی بجردھر بار بار چلّا رہے تھے۔ کیوں ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہو۔ سب کو ملے گا۔ کوئی خالی ہاتھ نہ جانے پائے گا۔ لیکن پھر بھی غربا کو صبر نہ ہوتا تھا۔

منشی جی نے چکردھر کو دیکھتے ہی دوڑ کر گلے لگا لیا اور دونوں آدمی رونے لگے اہلیا شوہر کے پیچھے کھڑی تھی۔ منو اس کی گود میں بیٹھا طفلانہ حسرت سے دونوں آدمیوں کا رونا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سمجھا اِن دونوں میں ضرور مار پیٹ ہوئی ہے شاید دونوں نے ایک دوسرے کا گلا پکڑ کر دبایا ہے جبھی تو یوں رو رہے ہیں۔ بابو جی کا گلا دکھ رہا ہوگا، یہ سوچ کر اُس نے بھی رونا شروع کیا۔ منشی جی اُسے روتے دیکھ کر بڑھے کہ اس کو گود میں لے کر پیار کروں۔ مگر منو نے منہ پھیر لیا۔ جس نے ابھی بابو جی کو مار کر رلایا ہے، وہ کیا اسے نہ مارے گا۔ کتنی خوفناک صورت ہے ضرور مارے گا۔

دفعتاً راجہ صاحب اندر سے بدحواس دوڑے ہوئے آئے۔ صورت سے معلوم ہوتا تھا امید نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ آتے ہی آتے پوچھا۔ میرا تار مل گیا تھا؟

چکردھر۔ آج صبح ملا۔ رانی جی کا کیا حال ہے۔

راجہ۔ وہ تو اپنی آنکھوں دیکھو گے، میں کیا کہوں۔ اب تو ایشور ہی کا بھروسہ ہے۔ اچھا یہ شنکھ دھر مہاشے ہیں!

یہ کہہ کر اُنہوں نے منو کو گود میں لے لیا۔ اُنہیں ایسا معلوم ہوا کہ اُن کی آنکھوں کی بصارت تیز ہوتی ہے۔ بولے۔ میری سُکھدا بالکل ایسی ہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، اس کا چھوٹا بھائی ہو۔ ہو بہو یہی صورت تھی۔

چکر دھر نے اندر جا کر منورما کو دیکھا۔ وہ موٹے گدوں میں ایسی سما گئی تھی۔ کہ معلوم ہوتا تھا بستر خالی ہے۔ صرف چادر پڑی ہوئی ہے۔ چکر دھر کی آہٹ پاکر اُس نے چادر سے منہ باہر نکالا۔ شمع کی ہلکی روشنی میں کسی بیکس کی آہِ مظلوم آنکھوں سے آسمان کی طرف تاک رہی تھی۔

راجہ صاحب نے آہستہ سے کہا۔ نورا! تمہارے بابوجی آ گئے۔

منورما نے تکئے کا سہارا لے کر کہا۔ زہے نصیب۔ آئیے بابوجی آپکے درشن بھی ہو گئے۔ تار نہ جاتا تو آپ کیوں آتے۔

چکر دھر۔ مجھے تو بالکل خبر ہی نہ تھی۔ تار پہونچا تو حال معلوم ہوا۔

منورما۔ خیر! آپ آ گئے۔ یہ آپ کی شفقت ہے۔ مجھے تو امید نہ تھی۔

راجہ۔ بار بار کہتی تھیں وہ نہ آئیں گے۔ لیکن میرا دل کہتا تھا کہ آپ یہ خبر پا کر رُک نہیں سکتے۔ شہر کے سب بیدوں حکیموں کو دیکھ چکا۔ اب ایشور ہی کا بھروسہ ہے۔

چکر دھر۔ میں بھی ایک ڈاکٹر کو ساتھ لیتا آیا ہوں۔ بہت ہی ہوشیار آدمی ہیں۔

منورما۔ (بچے کو دیکھ کر) اچھا! اہلیا دیوی بھی آئی ہیں۔ اور یہ ٹھاکر شنکھدھر ہیں۔ بابا! ذرا یہاں تو لانا اہلیا، اِسے چھاتی سے لگا لوں۔

راجہ۔ اِس کی صورت سُکھدا سے بہت ملتی ہے نورا! بالکل اِس کا چھوٹا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

"سکھدا" کا نام سُنکر اہلیا پہلے بھی چونکی تھی۔ اب پھر چونکی۔ بچپن کے دن کسی بھولے ہوئے خواب کی طرح ادرات کے دائرے میں آ گئے۔ اُس نے گھونگھٹ کی آڑ سے راجہ صاحب کی طرف دیکھا۔ اُسنے اپنے ملفظے پر ایسی ہی صورت کھینچی ہوئی نظر آئی۔

منو کو گود میں لیتے ہی منورما کے نیم جاں جسم میں ایک حرارت سی پیدا ہو گئی۔ بچے کو سینے سے لگائے ہوئے اُسے ایسی مسرت ہو رہی تھی۔ گویا برسوں سے پیاسے حلق میں ٹھنڈا پانی پڑ گیا ہو۔ اور اس کی پیاس نہ بجھتی ہو۔ وہ بچے کو لئے ہوئے اُٹھ بیٹھی اور بولی۔ اہلیا۔ میں اب یہ لال تمہیں نہ دوں گی۔ اسے مجھے دے دو۔

راجہ صاحب نے منورما کو سنبھال کر کہا۔ لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔ بدن میں ہوا لگ رہی ہے۔ کیا کرتی ہو۔

مگر منورما بچے کو لئے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اور راجہ صاحب بھی اسکے پیچھے پیچھے دوڑے کہ کہیں وہ گر نہ پڑے۔ کمرے میں صرف چکر دھر اور اہلیا رہ گئے۔ تب اہلیا آہستہ سے بولی۔ مجھے اب یاد آ رہا ہے کہ میرا نام بھی "سکھدا" تھا۔

چکر دھر نے بے اعتنائی سے کہا۔ ہاں، یہ کوئی نیا نام نہیں۔

اہلیا۔ میرے بابو جی کی صورت راجہ صاحب سے بہت ملتی تھی۔

چکر دھر نے پھر بے اعتنائی سے کہا۔ ہاں۔ کبھی کبھی آدمی کی صورت مل جاتی ہیں۔

اہلیا۔ نہیں بالکل ایسے ہی تھے۔

چکر دھر۔ ہو سکتا ہے۔ بیس سال کی صورت اچھی طرح ذہن میں تو نہیں رہتی۔

اہلیا۔ ذرا تم راجہ صاحب سے پوچھو کہ آپ کی سکھدا کب کھوئی تھی۔

چکر دھر نے جھنجلا کر کہا۔ چپ چاپ بیٹھو۔ تم اتنی خوش نصیب نہیں ہو۔ راجہ صاحب کی سکھدا کہیں کھوئی نہیں مر گئی ہو گی۔

راجہ صاحب اس وقت بچے کو گود میں لئے کمرے میں آئے۔ چکر دھر کے آخری الفاظ ان کے کان میں پڑ گئے۔ بے صبری کے ساتھ بولے۔ نہیں بابوجی میری سکھدا مری نہیں۔ کمبھ کے میلے میں کھو گئی تھی۔ اُسے بیس سال ہو گئے اس وقت اس کی عمر کوئی چار سال کی رہی ہو گی۔ بہت تلاش کی پر کچھ پتہ نہ چلا۔ اس کی ماں اسی غم میں مر گئی۔ میں بھی برسوں پاگل بنا رہا۔ آخر صبر کر کے بیٹھ رہا۔

اہلیا نے سامنے آکر بے حجابانہ انداز سے کہا۔ میں بھی تو تربینی کے اشنان میں کھو گئی تھی۔ آگرے کی سیوا سمتی والوں نے مجھے کہیں روتے پایا اور آگرے لے گئے۔

راجہ۔ تمہاری اس وقت کیا عمر ہو گی بیٹی!

اہلیا۔ چوبیسواں لگا ہے۔

راجہ۔ تمہیں اپنے گھر کی کچھ یاد ہے۔ تمہارے دروازے پر کس چیز کا درخت تھا؟

اہلیا۔ شاید برگد کا درخت تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ میں اس کے گودے چن چن کر کھایا کرتی تھی۔

راجہ نے اور قریب آکر اسکے منہ کی طرف تاکتے ہوئے رقت آمیز لہجہ میں کہا تمہیں اپنے اماں کی کچھ یاد آتی ہے؟

اہلیا نے سر ہلا کر کہا۔ ہاں یاد کیوں نہیں آتی۔ سانولا رنگ تھا، دبلی پتلی اور لمبی

تھیں۔ دن بھر کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔
راجہ صاحب کانپتی ہوئی آواز میں بولے۔ گھر میں اور کون کون لوگ تھے۔
اہلیا۔ میری ایک بڑھیا دادی تھیں۔ جو مجھے گود میں لے کر کہانی سنایا کرتی تھیں۔ ایک بوڑھا نوکر تھا۔ جس کے کندھے پر میں روز سوار ہوا کرتی تھی۔ دروازے پر ایک بڑا سا گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ دروازے پر ایک کنواں تھا۔ پیچھے کیطرف ایک بڑھیا چمارن کا مکان تھا۔
راجہ صاحب نے فرط اشتیاق سے آغوش پھیلاتے ہوئے کہا بس بس بیٹی آ۔ آ تجھے سینے سے لگا لوں۔ تو ہی میری سکھدا ہے۔ میں تجھے دیکھتے ہی تاڑ گیا تھا۔ میری سکھدا مل گئی! میری سکھدا مل گئی!!
راجہ صاحب پر مسرت کا ایک جنون طاری ہو گیا۔ چکردھر نے بے رخی کے ساتھ کہا۔ ابھی آپ کا خاموش رہنا ہی مناسب ہے۔ ممکن ہے آپ غلطی کر رہے ہوں۔
راجہ صاحب نے زور دیکر کہا۔ ذرا بھی نہیں۔ جو بھر بھی نہیں۔ میری سکھدا یہی ہے۔ اس نے جتنی باتیں بتائیں سب ٹھیک ہیں۔ مجھے رتی بھر بھی شبہ نہیں رہا۔ ہائے! آج اس کی ماتا ہوتی تو اسے کتنی خوشی ہوتی۔ کیا لیلا ہے ایشور کی۔ ذرا سی گئی اور بڑی ہو کر آئی۔ اور میری تاریک زندگی کو روشن کرنے کے لئے ایک چاند سا بچہ بھی لائی۔ آؤ بھئیا چکردھر تمہیں بھی سینے سے لگا لوں۔ ابتک تو تم میرے دوست تھے۔ اب میرے لڑکے ہو۔
چکردھر بے دل سے کھڑے تھے۔ منورما باغ باغ ہو رہی تھی اور اہلیا کھڑی رو رہی تھی۔ اس وقت رانی کمرے کے دروازے سے جاتی ہوئی نظر آئی۔ راجہ صاحب دیوانہ وار باہر نکل آئے اور بولے۔ کہاں جاتی ہو رانی۔ میری سکھدا مل گئی۔ آؤ دیکھو یہ اُسکا

لڑکا ہے۔

روہنی وہیں ٹھٹھک گئی اور مشتبہ انداز سے بولی۔ کیا آسمان سے ٹوٹ آئی ہے کیا۔

راجہ۔ نہیں نہیں آگرے میں تھی۔ دیکھو یہ اس کا لڑکا ہے۔ میری صورت اس سے کتنی ملتی ہے۔ آؤ سکھدا کو دیکھو۔

روہنی نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔ یہ آپ کی سکھدا نہیں۔ رانی منورما کا رچا ہوا کھیل ہے۔

راجہ صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ کیا یہ میری سکھدا نہیں ہے۔ یہ تم کیا کہتی ہو۔ میں نے خوب امتحان کر کے دیکھ لیا۔

روہنی۔ ایسے مداری کے کھیل بہت دیکھے چکی ہوں۔ مداری بھی آپ کو ایسی باتیں بنا دیتا ہے۔ جو آپ کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ یہ تو سب شعبدہ بازی ہے۔

راجہ۔ کیوں ناحق کسی پر تہمت لگاتی ہو روہنی۔ منورما کو بھی تو وہ باتیں معلوم نہیں ہیں۔ جو سکھدا نے مجھے بتا دیں۔ بھلا کسی غیر کی لڑکی کو منورما کیوں میری لڑکی بتائیں گی۔ اس میں اس کی کیا غرض ہو سکتی ہے۔

روہنی۔ وہ تمہاری جڑ کھودنا چاہتی ہے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ پھر دھر کو راجہ بنا کر وہ آپ کو کونے میں بٹھا دے گی۔ یہی لڑکا جو آپ کی گود میں ہے۔ ایک دن آپ کا دشمن ہوگا۔ یہ سب سدھی بدی باتیں ہیں۔ جسے آپ مٹی کی گور سمجھتے ہیں۔ وہ آپ جیسوں کو بازار میں بیچ سکتی ہے۔

راجہ نے بے قرار ہو کر کہا۔ اچھا اب چپ رہو روہنی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ تمہارے دل میں میری بد اندیشی کے سوا اور کوئی خیال نہیں۔ آج نہ جانے کس کی دعا سے ایشور نے مجھے یہ دن دکھایا ہے۔ اور تم منہ سے ایسے نازیبا کلمات نکال

رہی ہو۔ ایشور نے مجھے وہ سب کچھ عطا کر دیا۔ جس کی مجھے خواب میں بھی اُمید نہ تھی۔ یہ چاند سا بچہ میری گود میں کھیلے گا۔ یہ امید کس کو تھی۔ اور ایسے مبارک موقع پر اتنے زہر اُگل رہی ہو۔

یہ کہتے ہوئے راجہ صاحب اُسی جوش میں دیوان خانہ میں جا پہونچے۔ دروازے پر ابھی تک کنگلوں کا ہجوم تھا۔ دو چار عملے ابھی تک بیٹھے دفتر کا کام کر رہے تھے۔ راجہ صاحب نے شنکھ دہر کو کندھے پر بٹھا کر بلند آواز میں کہا۔ دوستو! یہ دیکھو ایشور کی رحمت بیکران سے میرا انور سا گھر بیٹھے میرے پاس آ گیا۔ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ بیس سال ہوتے میری لڑکی سکھدا کمبھ کے میلے میں کھو گئی تھی۔ وہی سکھدا آج مجھے مل گئی ہے۔ اور یہ بچہ اُس کا لڑکا ہے۔ آج سے تم لوگ اسے اپنا ولیعہد سمجھو۔ میرے بعد یہی اِس ریاست کا جانشین ہوگا، گارد سے کہدو، اپنے ولیعہد کی سلامی دے۔ نوبت خانہ میں کہدو۔ نوبت بجے۔ آج کے ساتویں دن ولیعہد کے تلک کی رسم ادا ہوگی۔

یہ حکم دے کر راجہ صاحب بچہ کو گود میں لئے ٹھاکر دوارے میں جا پہونچے۔ وہاں اِس وقت ٹھاکر جی کے بھوگ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سادھو سنتوں کا ہجوم تھا۔ ایک پنڈت جی کوئی کتھا کہہ رہے تھے۔ مگر حاضرین کے کان اُس گھنٹے کی طرف لگے ہوئے تھے جو ٹھاکر جی کی پوجا کی خبر دیگی۔ اور جس کے بعد اشیاء لطیف کے درشن ہونگے۔ دفعتاً راجہ صاحب نے آکر بچہ کو ٹھاکر جی کے سامنے بٹھا دیا اور خود سر و قد ڈنڈوت کرنے لگے۔ اتنے خلوص سے انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی ایشور کی عبادت نہ کی تھی۔ اس مسرت میں اُنہیں ساری دُنیا خوشی سے رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ٹھاکر جی خود سنگھاسن سے اُتر کر بچہ کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیر رہے ہیں۔ آج ان کا نخلِ مُراد بار در ہوا۔

یہ ایشور کا رحم نہیں تو اور کیا ہے۔ فرزند کے سامنے ثروت و مال کی حقیقت کیا۔ حیات کا مقصد ہی کیا ہے؟ عمل کی غایت ہی کیا ہے؟ اپنے لئے کون بنا کے منصوبے باندھتا ہے؟ اپنی تو ارادوں میں ہی ختم ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ جب ارادوں کے پورے ہونے کے دن آتے ہیں۔ تو ہماری منزل حیات قریب ہوتی ہے۔ فرزند ہی تمناؤں کا سرچشمہ، خواہشوں کا مرکز، علایق کی زنجیر اور زندگی کا سب کچھ ہے۔ وہی فرزند آج بشال سنگھ کو مل گیا تھا۔ اُس معصوم بچے کو سینے سے لگا کر اُنہیں اپنے اندر سوئی ہوئی طاقت کا احساس ہو رہا تھا اب انکے لئے دُنیا ہی جنت تھی۔

پوجاری نے کہا۔ بھگوان راج کنوز کی عمر دراز کرے۔

راجہ صاحب نے اپنے ہیرے کی انگوٹھی اتار کر اُسے دیدی۔ ایک باباجی کو اسی دُعا کے لئے سو بیگھے کی معافی مل گئی۔

ٹھاکر دوارے سے جب وہ گھر میں آئے تو دیکھا جگر دھر آسن پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور منورما سامنے کھڑی کھانا پروس رہی ہے۔ اُس کے چہرے پر مسرت کی سُرخی جھلک رہی تھی۔ کوئی یہ قیاس نہ کر سکتا تھا۔ کہ یہ وہی مریضہ ہے جو ابھی دس منٹ پہلے بستر مرگ پر پڑی ہوئی تھی۔

(۳۲)

شباب انسانی زندگی کا معراج ہے طفلی میں اگر ہم سُنہرے خواب دیکھتے ہیں تو شباب اُن خوابوں کی تعبیر ہے۔ اور بڑھاپا اُس تعبیر کی یادگار۔ ہماری ساری جسمانی اور دماغی قوتوں کے ارتقا کا نام جوانی ہے۔ کلی کو کون پوچھے اگر اس کے پھول ہونے کی امید نہ ہو۔ اور مُرجھایا ہوا پھول پیروں تلے روندے جانے کے سوا

اور کس کام آتا ہے۔ اگر کائنات کی ساری برکتیں ایک طرف رکھدی جائیں۔ اور شباب دوسری طرف، تو ایسا کون انسان ہے جو اُس مال و زر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ رانی دیو پریا کی سی خوش نصیب اور کون عورت ہوگی۔ جسے ایک بار شباب نے پھر اپنی گود میں لے لیا ہے۔

شام کا وقت تھا، رانی دیو پریا ایک کوہستانی غار میں ایک چٹان پر بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ کنور نہندر سنگھ اس کے قریب بیٹھے ہوئے اُسکے چہرے کی طرف پر اُمید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا جسم لاغر ہو گیا ہے۔ چہرہ زرد ہے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ جیسے کوئی تپ دق کا مریض ہو۔ یہاں تک کہ اُسے سانس لینے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ زندگی کی اگر کوئی علامت ہے تو وہ ان کی آنکھوں میں اُمید کی جھلک ہے۔ آج ان کی تپسیا کا آخری دن ہے آج دیو پریا کی زندگی میں نئی بہار شروع ہوگی۔ سوکھا ہوا درخت نئی نئی کونپلوں سے لہرائے گا۔ کنور صاحب بار بار اُسکے بے حرکت سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے ہیں کہ خون کی گردش ہونے میں کتنی دیر ہے۔ اور زندگی کی کوئی علامت نہ پاکر مایوس ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں اندیشہ ہو رہا ہے، میری تپسیا بیکار تو نہ ہوگی۔

دفعتاً مہندر چونک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ روحانی مسرت سے چہرہ روشن ہو گیا۔ دیو پریا کے تار تار سے دل میں نغمہ حیات کا زمزمہ ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ میں اسکے نیلے ہونٹوں پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھیں کھل گئیں۔ اور چہرے پر زندگی کی رونق نمودار ہو گئی۔ اُس نے ایک انگڑائی لی۔ اور تعجب آمیز نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر چٹان سے اُٹھ بیٹھی۔ اُس کا دلفریب حسن دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا۔ کہ وہ موت کے پنجے سے نکل آئی ہے۔ یہ وہی دیو پریا ہے۔ جو امید اور بیم سے کانپتا ہوا دل لئے آج سے چالیس برس پہلے سسرال آئی

تھی۔ وہی شباب کی لطافت تھی، وہی آنکھوں کو مسحور کرنے والی رعنائی، وہی شگفتہ تبسم، وہی نازک جسم۔ اُسے اپنے جسم کے ایک ایک عضو میں نئی زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن خاصہ تن تبدیل ہو جانے پر بھی اُسے اپنی زندگی کی پہلی ساری باتیں یاد تھیں۔ لٹے ہوئے سہاگ کے زمانہ کی نفس پروری اپنی کروہ صورت میں سامنے کھڑی تھی۔ ایک لمحہ تک وہ شرم اور ندامت کے باعث کچھ بول نہ سکی۔ کنور صاحب کے اِس عاشقانہ سرفروشی کے آگے۔ اسکی عصمت فروشانہ زندگی کتنی شرمناک تھی۔

مہندر نے مسکرا کر کہا۔ یہ میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔ ابھی ایک لمحہ پہلے تمہاری حالت دیکھ کر میں اپنی دلیری پر افسوس کر رہا تھا۔

دیو پریا نے مہندر کو محبت سے متوالی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ پران ناتھ! تم نے میرے ساتھ جو نیکی کی ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔

دیو پریا کے دِل میں ایک ولولہ سا اُٹھا کہ شوہر کے قدموں پر سر رکھدے اور کہے۔ تم نے مجھے وہ نعمت عطا کر دی جو ہمیشہ سے انسانی تخیل کا سنہرا خواب رہی ہے۔ مگر حجاب نے زبان پر مُہر لگا دی۔

مہندر۔ سچ کہنا۔ تمہیں یقین تھا کہ میں تمہاری تبدیل ہیئت کر سکوں گا۔

دیو پریا۔ پیارے! تم کیوں پوچھتے ہو۔ مجھے یقین نہ ہوتا تو تمہارے پاس آتی ہی کیوں۔

مہندر۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس عمل میں کتنے دن لگے۔

دیو پریا۔ میں کیا جانوں۔ کتنے دن لگے۔؟

مہندر۔ پورے تین سال۔

دیوپریا۔ تین سال! تین سال سے تم میرے لئے تپسیا کر رہے ہو۔؟
مہندر۔ تین کیا اگر تیس سال بھی یہ تپسیا کرنی پڑتی۔ تو میں شوق سے کرتا۔
دیوپریا نے شرماتے ہوئے پوچھا۔ یہ تو نہ ہوگا کہ دو چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ ہوجاتے؟

مہندر۔ نہیں جان من! اسکا کوئی اندیشہ نہیں۔
دیوپریا۔ ہم لوگ اس وقت ہیں کہاں۔؟
مہندر۔ ایک پہاڑ کے غار میں۔ میں نے اپنے شاہی اختیارات اپنے وزیر کو دے دیئے۔ اور تمہیں لے کر یہاں چلا آیا۔ سلطنت کے تفکرات میں پڑکر میں اس عمل میں کامیاب نہ ہوسکتا تھا۔ اب شاید میں اپنے راج پر قابض نہ ہوسکوں مگر تمہارے لئے ایسے کئی راج قربان کرسکتا ہوں۔
دیوپریا کو اب ایک ایسی نایاب چیز مل گئی تھی۔ جس کے مقابلے میں شاہی اقتدار کی کوئی ہستی نہ تھی۔ صحرائی زندگی کا تخیل اُسے اس وقت نہایت دلاویز معلوم ہوا۔ محبت کی خوشیوں میں ڈوب جانے کے لئے، کنور صاحب اپنی وفادار خلوص کے اظہار کے لئے یہاں جتنے موقع تھے اتنے شاہی محل میں کہاں مل سکتے تھے۔ اُسے شاہی اقتدار کی ذرا بھی تمنا نہ تھی۔ خوش ہوکر بولی یہی تو میں چاہتی تھی۔
مہندر۔ اس بے سروسامانی کی زندگی تمہیں ناگوار تو نہ گذرے گی؟ ابھی تمہیں اس زندگی کی تکلیفوں کا اندازہ نہیں ہے۔ اگر تم ان تکلیفوں کو برداشت نہ کرسکو۔ تو میں ایک بار پھر شاہی اقتدار کے لئے کوشش کرسکتا ہوں۔
دیوپریا۔ تمہارے ساتھ میں سب کچھ خوشی سے جھیل سکتی ہوں۔
اسی وقت دیوپریا نے غار سے باہر نکل کر دیکھا تو چاروں طرف تاریکی کا

عالم تھا۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں اُسے وہاں کی سب چیزیں صاف نظر آنے لگیں سامنے اونچی پہاڑیوں کے سلسلے بہشتی حوروں کے محل سے معلوم ہوتے تھے۔ داہنی طرف درختوں کی قطار، سادھوؤں کی کٹیوں سی نظر آتی تھی۔ اور بائیں طرف تاروں سے جگمگاتی ہوئی رانی کسی پنہارن کی طرح میٹھے راگ گاتی اٹھلاتی چلی جاتی تھی۔

دفعتاً دیو پریا کے دل میں ایک حسرتناک خیال پیدا ہوا۔ میری ہوس پروری کہیں پھر تو مجھے تباہ نہ کر دے گی۔

(۳۳)

راجہ بشال سنگھ نے ادھر کئی سالوں سے ریاست کے کاموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ منشی بجردھر اور دیوان صاحب کی چڑھ بنی تھی۔ گرو سیوک سنگھ بھی اپنے راگ رنگ میں مست تھے۔ رعایا کے سُکھ دُکھ کی فکر اگر کسی کو تھی۔ تو وہ منورما تھی۔ راجہ صاحب کے انصاف اور حق کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ منورما کو پاکر اُنہیں کسی چیز کی سُدھ نہ تھی۔ اُنہیں ایک لمحہ کے لئے بھی منورما کی جدائی شاق تھی۔ ان کی حالت اُس فلاںچ کی سی تھی۔ جو کہیں سے دولت بیکراں پا جائے اور شب و روز اُسی فکر میں پڑا رہے۔ ان کی نگاہ میں منورما ورق گل سے بھی زیادہ نازک تھی۔ اُسے کچھ ہو نہ جائے۔ اُنہیں یہی اندیشہ ہمیشہ ہوتا رہتا تھا۔ دوسری رانیوں کی اب وہ خوشامد کرتے رہتے تھے۔ جس میں وہ منورما کو کچھ کہہ نہ بیٹھیں منورما کو بات کس قدر لگتی ہے۔ اس کا اُنہیں تجربہ ہو چکا تھا۔ روہنی کے ایک طعنہ نے اُسے کاشی چھوڑ کر اس گاؤں میں لا بٹھایا تھا۔ ویسا ہی دوسرا طعنہ اس کی جان لے سکتا تھا۔ اِس لئے وہ رانیوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔ خاصکر روہنی کو۔ حالانکہ وہ منورما کو جلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔

لیکن اِس بچے نے آکر راجہ صاحب کی زندگی میں ایک نئی اُمنگ ڈالدی اب تک ان کی زندگی کا کوئی مدار نہ تھا۔ دِل میں سوال ہوتا تھا کس کے لئے مروں؟ کون رونے والا بیٹھا ہوا ہے؟ دیوتا ہی نہ تھا تو مندر کی تعمیر کیسے ہوتی۔ اب وہ دیوتا اُتر آیا تھا۔ پھر مندر کی تعمیر کیوں نہ ہوتی۔ اب وہ ریاست کے کاموں سے کنارہ کش کیوں رہتے۔

منشی بجردھر اتبک تو دیوان صاحب سے ملکر اپنا مطلب نکال لیتے رہتے تھے۔ مگر اب وہ کسی کو کیوں گننے لگے تھے۔ دیوان صاحب سے ایک دن کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ دیوان صاحب اگر منورما کے باپ تھے۔ تو منشی جی ولیعہد کے دادا تھے پھر دونوں میں کون دبتا۔ عملے منشی جی کو دیکھتے ہی تھر تھر کانپنے لگتے تھے نصیب کسی کا چمکے تو ایسا چمکے۔ کہاں پنشن کے پچیس روپیوں پر گذر بسر ہوتی تھی کہاں اب ریاست کے مالک تھے۔ اگر کوئی عملہ ان کے حکم کی تعمیل کرنے میں دیر کرتا تو جامے سے باہر ہوجاتے۔ یہاں تمہاری دال نہ گلے گی۔ سمجھ گئے۔ ایک ایک کو نکال جاؤں گا۔ راجہ صاحب بھی اب ان کا بہت ادب کرتے تھے۔

مگر منشی جی کی یہ زبان درازی اور تنگ ظرفی لوگوں کو بُری معلوم ہوتی تھی چکردھر کے کانوں میں کبھی یہ باتیں پڑ جاتیں تو مارے شرم کے گڑ جاتے تھے۔ وہ آجکل منشی جی سے بہت کم بولتے۔ گھر پر بھی بہت کم جاتے۔ دوستوں سے ملنا جُلنا بہت کم کر دیا تھا۔ حالانکہ اب دوستوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ فی الحقیقت یہاں کی زندگی اُن کے لئے قابل برداشت ہوگئی تھی۔ وہ پھر اپنے اُسی گوشہ عافیت میں واپس جانا چاہتے تھے۔ یہاں آئے دِن کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوجاتی تھی جو اُنہیں دن بھر مضطرب رکھنے کو کافی ہوتی تھی۔ کئی بار اُنہیں مجبور ہوکر کارکنوں کو تنبیہ اور نوکروں کی گوشمالی کرنی پڑتی تھی۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ

تھا۔ کہ یہاں ان کی زندگی کے پرانے اصول ٹوٹتے چلے جاتے تھے۔ وہ بہت کوشش کرتے کہ ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ پر قریب قریب روز ہی ایسے موقعے آپڑتے تھے۔ کہ انہیں لاچار ہوکر آئین سیاست سے کام لینا پڑتا۔

مگر اہلیا کی حالت بالکل اسکے برعکس تھی۔ بہت دنوں تک دُکھ جھیلنے کے بعد اُسے یہ راحت میسّر ہوتی تھی۔ اور وہ اسکا لُطف اٹھا رہی تھی۔ اپنے پرانے دِن اُسے بہت جلد بھول گئے تھے۔ اور ان کی یاد دلانے سے اُسے ملال ہوتا تھا۔ اُس کا طریق معاشرت بالکل تبدیل ہوگیا تھا۔ وہ اچھی خاصی امیرزادی بنگئی تھی۔ سارے دِن عیش و تفریح کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔ شوہر کے دِل پر کیا گذر رہی ہے۔ یہ سوچنے کی تکلیف وہ کیوں اٹھاتی۔ جب وہ خوش تھی تو اسکا شوہر بھی ضرور ہی خوش ہوگا۔ ثروت اور اقتدار پاکر کون رنجیدہ رہتا ہے۔ اسکا حُسن اب بدرِ کامل کی طرح پُرشکوہ ہوگیا تھا۔ اس کی وہ سادگی، وہ انکسار، وہ تیزداری غائب ہوگئی تھی۔ وہ اب ایک مغرور، نازک طبع نفاست پسند نازنین تھی جس کی آنکھوں سے مد چھلکا پڑتا تھا۔ چکردھر نے جب اُسے پہلی بار دیکھا تھا تب وہ ایک کونپل تھی اب منورما ایک نوشگفتہ صبح کی زرین شعاعوں سے مُسکراتا ہوا پھول۔ اب اہلیا منورما ہوگئی تھی اور منورما اہلیا۔ اہلیا پہر دن چڑھے انگڑائیاں لیتی ہوئی آرامگاہ سے نکلتی۔ منورما پہر رات ہی سے گھر کا کوئی نہ کوئی کام کرنے لگتی تھی۔ شنکدھر اب منورما ہی کے پاس رہتا تھا۔ وہی اس کی نازبرداری کرتی تھی۔ اہلیا صرف اُسے کبھی کبھی گود میں لے کر پیار کرلیتی۔ گویا کسی دوسرے کا لڑکا ہو۔ منورما کی تو اس میں اب جان ہی بستی تھی۔ کبھی کبھی وہ عالم تنہائی میں منورما بچے کو گود میں لئے گھنٹوں مُنہ چھپائے روتی۔ جب شنکدھر اُسے روتے دیکھ کر رونے لگتا تو وہ آنسو پی جاتی اور ہنسنے کی کوشش کرتی۔ اس کی تمکنت ایک گہرے

فکر اور دردناک حسرت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ اہلیا سے دبتی تھی۔ مگر اہلیا اُس سے کھنچی رہتی تھی۔ شاید وہ منور ملک کے اختیارات اور تصرف کرنا چاہتی تھی۔ مگر رانی اپنے اختیارات کا ایک شمہ بھی نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ یہی اُس کی زندگی کا سہارا تھا۔

اب چکردھر اہلیا سے اپنے دل کی باتیں کبھی نہ کہتے تھے۔ یہ ثروت انکی زندگی کو تباہ کئے ڈالتی تھی۔ کیا اہلیا یہ ناز و نعمت چھوڑکر انکے ساتھ چلنے پر راضی ہوگی؟ انہیں خوف ہوتا تھا۔ کہ کہیں وہ اِس تجویز کا مذاق نہ اُڑا لے۔ پھر اُنہیں کیا حق ہے کہ وہ اُسے اپنے ساتھ تکلیفیں جھیلنے کے لئے مجبور کریں۔ اگر وہ عارضی جوش میں آکر اس کے ساتھ چلنے پر تیار بھی ہو گئی۔ تو کیا اِس بے سرو سامانی میں وہ خوش بھی رہے گی؟ کیا منوراما شنکھدھر کو چھوڑ بھی دے گی؟ کیا شنکھدھر کو چھوڑکر اہلیا ان کے ساتھ جائے گی؟ اسیطرح کے کتنے ہی سوالات چکردھر کے دِل میں پیدا ہوتے رہتے تھے اور وہ اسیطرح اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ نہ کرسکتے تھے۔ صرف ایک ہی بات یقینی تھی۔ وہ اِن بندشوں میں پڑکر اپنی زندگی برباد نہ کرنی چاہتے تھے۔ ثروت پر اپنے اصولوں کو قربان نہ کرسکتے تھے۔

ایک دن چکردھر بیٹھے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ کہ منشی جی نے آکر کہا بیٹا! ذرا ایک بار ریاست کا دورہ کیوں نہیں کرآتے۔ آخر دِن بھر پڑے ہی تو رہتے ہو۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ تم کس قماش کے آدمی ہو۔ بیچارے راجہ صاحب تنہا کہاں جائیں اور کیا کریں۔ رہا میں۔ وہ کسی مصرف کا نہیں۔ مجھ سے کسی دعوت یا برات یا مجلس کا انتظام کرنے کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ گاؤں گاؤں دوڑنا میرے بس کی بات نہیں۔ اب تو خدا کے فضل و کرم سے ریاست اپنی ہے۔ ہاتھی، گھوڑے، موٹریں سب کچھ موجود ہیں کبھی کبھی علاقہ کا چکر لگا آیا کرو۔

اسی طرح دھاک بیٹھیگی۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے تمہیں کون جانتا ہے۔

چکردھر نے بے نیازی کے انداز سے کہا۔ میں اِس وبال میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں تو یہاں سے چلنے کو تیار بیٹھا ہوا ہوں۔

منشی جی چکردھر کا منہ تاکنے لگے۔ بات اتنی انوکھی اور نرالی تھی کہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ پوچھا۔ کیا اب بھی وہی سنک سوار ہے؟

چکردھر۔ آپ اُسے سنک، جنون، فتورِ عقل جو چاہیں سمجھیں۔ مگر مجھے تو گوشہ عافیت میں جتنا اطمینان ہوتا ہے۔ وہ اِس طمطراق میں نہیں ہوتا۔ آپ کو بھی میری یہی صلاح ہے کہ آرام سے گھر میں بیٹھکر بھگوان کا بھجن کیجئے۔

منشی۔ کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا۔ ایک ایک انگل زمین کے لئے تو خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ اور تم اتنی بڑی ریاست پاکر ایسی باتیں کرتے ہو۔ اب تم سمجھدار ہوئے۔ ان پرانی باتوں کو دل سے نکال ڈالو۔ خدا نے تمہیں جو رتبہ عطا کیا ہے۔ اس کا شکر بجا لاؤ اور ریاست کا انتظام اپنے ہاتھ میں لو۔

چکردھر کو اب اطمینان ہوا کہ وہ یہاں اطمینان سے نہ بیٹھنے پائیں گے۔ آج منشی جی نے یہ نصیحت کی۔ ممکن ہے کل اہلیا بھی یہی نصیحت کرے۔ انہیں محسوس ہوا کہ اگر بے لوث زندگی بسر کرنی ہے تو بہت جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہئے۔

ایک دن چکردھر ہوا کھانے نکلے۔ گرمی کے دن تھے۔ ہوا بند تھی۔ دیہات کی طرف دور نکل گئے۔ جیوں جیوں آگے بڑھتے تھے۔ سڑک خراب ہوتی جاتی تھی۔ دفعتاً انہیں راستے میں ایک بڑا سانڈ دکھائی دیا۔ بہت ہارن بجایا۔ پر سانڈ نہ ہٹا جب قریب آنے پر بھی سانڈ کھڑا ہی رہا تو انہوں نے چاہا کہ کترا کر نکل جائیں۔ مگر سانڈ سر جھکائے فوں فوں کرتا پھر سامنے آ کھڑا ہوا۔ چکردھر چھڑی ہاتھ میں لیکر نیچے اُترے کہ اُسے بھگا دیں۔ مگر وہ بھاگنے کے بدلے ان کے پیچھے دوڑا۔ خیریت

یہ ہوئی کہ سڑک کے کنارے ایک درخت مِل گیا۔ چھڑی پھینکی اور درخت کی ایک شاخ پکڑ کر لٹک گئے۔ سانڈ ایک منٹ تک تو درخت سے ٹکر لیتا رہا۔ پھر موٹر کے پاس آکر اُسے سینگوں سے نیچے کی طرف ٹھیلتا ہوا دوڑا۔ کچھ دُور کے بعد موٹر سڑک سے ہٹ کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ اب سانڈ پونچھ اٹھا کر بار بار زور لگاتا ہے۔ نیچے ہٹ ہٹ کر اس میں ٹکریں مارتا ہے۔ مگر موٹر جگہ سے نہیں ہلتی۔ تب اُس نے موٹر کے بغل میں جا کر اتنے زور سے ٹکر لگائی۔ کہ موٹر الٹ گئی۔ موٹر کے پہیے پھٹ گئے۔ کئی پرزے ٹوٹ گئے۔ چکردھر شاخ پر بیٹھے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ موٹر کی فکر تو نہ تھی۔ فکر یہ تھی کہ گھر کیسے لوٹیں گے۔ چاروں طرف تاریک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آدمی نہ آدم زاد۔ ابھی معلوم نہیں سانڈ کتنی دیر تک موٹر سے لڑیگا اگر اُن کے پاس اس وقت بندوق ہوتی تو سانڈ کو مار ہی ڈالتے۔ دِل میں سانڈ چھوڑنے کی رسم پر جھنجھلا رہے تھے۔ پاجی نے سانڈ چھوڑ رکھا ہے۔ اگر اس کا نام معلوم ہو جائے تو ساری جائداد بکوا لوں۔

سانڈ نے جب دیکھا کہ دُشمن کی دھجیاں اڑ گئیں اور اب وہ شاید پھر نہ اُٹھے تو ڈکارتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

چکردھر نیچے اُترے اور موٹر کو دیکھا تو وہ اُلٹی پڑی ہوئی تھی۔ موٹر کو سیدھا کرنا ایک آدمی کا کام نہ تھا۔ کسی آدمی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگے اتفاق سے پورب کی طرف تھوڑی ہی دُور پر ایک گانوں نظر آیا۔ اُسی طرف چلے راستے میں اِدھر اُدھر تاکتے تھے کہ کہیں سانڈ نیچے نہ آتا ہو۔ یہ ایک چھوٹا سا پُروا تھا۔ لوگ بھی تھوڑی ہی دیر پہلے اُوکھ کی سنچائی کر کے آئے تھے چکردھر نے ایک آدمی سے پوچھا تو معلوم ہوا گانوں کا نام بھیلسور ہے اور جگدیشپور کی ریاست میں ہے۔

چکردھر نے خشمناک لہجہ میں کہا۔ وہ بدمعاش سانڈ کس کا ہے۔ جو اس وقت سڑک پر گھوما کرتا ہے۔

ایک کسان نے جواب دیا۔ یہ تو نہیں جانتے صاحب۔ مگر اسکے مارے ناکوں دم ہے۔ اُدھر سے کسیکو نکلنے ہی نہیں دیتا۔ جس گانوں میں پہونچ جاتا ہے۔ دو چار بیلوں کو مار ڈالتا ہے۔

چکردھر۔ آج اُس بدمعاش نے مجھے مار ہی ڈالا تھا۔ میری موٹر الٹ دی۔ تم لوگ میرے ساتھ چلکر موٹر اٹھا دو۔

اس پر ایک دوسرا کسان اپنے دروازے سے بولا۔ سرکار! بھلا رات کو موٹر اٹھوا کر کیا کیجئے گا۔ وہ چلنے لایق تو ہوگی نہیں۔

چکردھر۔ تم لوگوں کو اُسے ٹھیلکر جگدیشپور تک لے جانا پڑے گا۔

پہلا کسان۔ سرکار رات بھر یہیں ٹھیریں۔ سویرے ہم گاڑی پر لاد کر موٹر پہونچا دیں گے۔

چکردھر نے جھلاکر کہا۔ کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ میں رات بھر یہیں پڑا رہوں گا۔ تم لوگوں کو اسی وقت چلنا ہوگا۔

چکردھر کو وہاں کوئی پہچانتا نہ تھا۔ لوگ سمجھے راجاؤں کے یہاں سبھی طرح کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہوگا کوئی۔ اس کے سوا وہ ٹھاکروں کا گانوں تھا اور ٹھاکر سے مدد کے نام جو کام چاہو لے لو۔ بیگار کے نام سے ان کا خون اُبل پڑتا ہے۔ کسان نے کہا۔ صاحب۔ اِس بکھت تو ہمارا جانا نہ ہوگا۔ اگر بیگار چاہتے ہوں تو وہ اُتر کیطرف دوسرا گانوں ہے۔ وہاں چلے جائیے۔ بہت سے چمار مل جائینگے۔

چکردھر نے غصہ میں آکر کہا۔ میں کہتا ہوں تم کو چلنا پڑے گا۔

کسان نے اکڑ کر کہا۔ تو صاحب اِس بات پر تو ہم جائیں گے۔ ہم پاسی چمار نہیں۔ ٹھاکر ہیں۔

چکردھر کو ایسا غصہ آیا کہ اسے ٹھوکریں مارتا ہوا لے چلیں۔ مگر ضبط کر کے بولے۔ شرافت سے کہتا ہوں تو تم لوگ اُڑن گھاٹیاں بتاتے ہو۔ ابھی کوئی چپڑاسی آکر دو گھڑکیاں جما دیتا تو سارا گاؤں بھیڑ کی طرح اس کے پیچھے چلا جاتا۔

کسان نے بے خوفی سے جواب دیا۔ سپاہی کیوں گھڑکیاں جمائے گا۔ کوئی چور ہیں۔ ہماری خوشی نہیں جاتے۔ آپ کو جو کرنا ہو کر لیجئے۔

چکردھر سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ چھڑی ہاتھ میں تھی ہی۔ باز کی طرح کسان پر ٹوٹ پڑے اور دھکا دے کر بولے۔ چلتا ہے یا جماؤں دو چار ہاتھ۔

چکردھر مضبوط آدمی تھے۔ کسان دھکا کھا کر گر پڑا۔ یوں وہ بھی کرارا آدمی تھا۔ الجھ پڑتا تو چکردھر کے چھکے چھوٹ جاتے۔ مگر وہ رعب میں آگیا۔ سوچا کوئی حاکم ہے۔ نہیں تو اس کی ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہی کیسے پڑتی۔ سنبھل کر اُٹھنے لگا۔ چکردھر نے سمجھا۔ شاید اٹھ کر مجھ پر وار کرے گا۔ لپک کر پھر ایک دھکا دیا۔ اسی وقت سامنے والے مکان میں سے ایک آدمی لالٹین لئے ہوئے باہر نکل آیا اور چکردھر کو دیکھ کر تعجب سے بولا۔ ارے بھگت جی! تم نے یہ بھیس کب سے بدلا۔ مجھے پہچانتے ہو۔ چکردھر اُسے فوراً پہچان گئے۔ یہ ان کا جیل کا ساتھی دھنا سنگھ تھا۔ چکردھر کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ شرماتے ہوئے بولے۔ کیا تمہارا گھر اسی گاؤں میں ہے دھنا سنگھ۔

دھنا سنگھ۔ ہاں اِسی گاؤں میں۔ وہ آدمی جسے آپ ٹھوکریں مار رہے ہیں میرا سگا بھائی ہے۔ کھانا کھا رہا تھا۔ جب تک اُٹھوں اُٹھوں تم گرم ہو گئے۔

تم اتنے غصہ ور کب سے ہو گئے۔ جیل میں تو تم دیا اور دھرم کے پتلے بنے ہوئے تھے کیا وہ دکھانے کے دانت تھے؟ نکلا تو کچھ اور ہی۔ جکر تھا۔ مگر تم اپنے پُرانے ساتھی نکلے۔ کہاں تو درو گہ کو بچانے کے لئے اپنی چھاتی پر سنگین روک لی تھی۔ کہاں آج ذرا سی بات پر اتنے جامہ سے باہر ہو گئے۔

چکردھر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اپنی صفائی میں ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکال سکے ان کی زندگی کی ساری کمائی جو انہوں نے نہ جانے کتنی قربانیوں کے بعد جمع کی تھی یہاں لُٹ گئی۔ ایک طرف ان کا جوش انصاف پامال ہو کر کسی بیکس بچے کی طرح دامن میں مُنہ چھپائے رو رہا تھا۔ دوسری طرف خفت کسی دیونی کی طرح ان کے سینے پر سوار تھی۔

دھنا نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ تو وہ زور سے ہائے ہائے کرکے چلا اٹھا۔ چکردھر نے دھنا سنگھ کو جو رہا سہا حُسن ظن تھا وہ بھی غائب ہو گیا ان کی طرف سرخ آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ کیا کہیں پورانے ساتھی ہو اور لپنے دروازے پر آئے ہو۔ نہیں تو اِس وقت تم زندہ نہ لوٹتے۔ تم اتنے بدل گئے اگر آنکھوں سے نہ دیکھتا تو مجھے کبھی اِس بات کا یقین نہ آتا۔ ضرور تمہیں کوئی عہدہ یا جائداد مل گئی ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ ہم بیکس ہیں۔ ابھی جا کر مہاراج کے ڈیوڑھی پر فریاد کریں تو تم کھڑے کھڑے نکال دیئے جاؤ۔ بابو چکردھر سنگھ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ اب کسی سرکاری آدمی کی مجال نہیں کہ بیگار لے سکے تم بیچارے کس گنتی میں ہو۔ عہدہ پاکر اپنے دن بھول نہ جانا چاہئے۔ تمہیں میں اپنا گرو اور دیوتا سمجھتا تھا۔ مجھے تو تم نے وہ سبق دیا اور آپ لگے غریبوں کو کچلنے۔ منا سنگھ نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ رات کو یہیں ٹھہر جاؤ۔ اسمیں کیا برائی تھی۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو کہدیتا تمہارا غلام نہیں ہوں۔ جیسے چاہو اپنی

موڑے جاؤ۔ مجھ سے مطلب نہیں۔ اُس نے تو تمہارے ساتھ شرافت کی اور تم اُسے مارنے لگے۔ اب بتاؤ اس کے ہاتھ کی کیا دوا کی جائے۔ سچ ہے رُتبہ پا کر آنکھیں پھر جاتی ہیں۔

چکر دھر نے شرمندہ ہو کر کہا۔ دھنا سنگھ اب مجھے معاف کرو۔ جو سزا چاہے دو سر جھکائے ہوئے کھڑا ہوں۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالوں گا۔

دھنا سنگھ رقت آمیز لہجہ میں بولا۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ بھگت جی، غصے میں آدمی کے منہ سے بُرا بھلا نکل ہی جاتا ہے۔ اس کا خیال نہ کرو۔ بھیا! بھائی کا ناتا بڑا گہرا ہوتا ہے۔ بھائی چاہے اپنا دشمن بھی ہو۔ لیکن کون آدمی ہے جو بھائی کو ٹھوکریں کھاتے دیکھ کر اپنا غصہ روک سکے۔ کہاں ہے موٹر چلو میں اٹھائے دیتا ہوں۔

چکر دھر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ جب تک ان کا ہاتھ اچھا نہ ہو جائیگا میں کہیں نہ جاؤں گا۔ ہاں کوئی آدمی ایسا ملے جو یہاں سے جگدیش پور جا سکے تو اُسے میری یہ چٹھی دے دو۔

دھنا سنگھ۔ جگدیش پور میں تمہارا کون ہے بھیا۔؟ کیا ریاست میں نوکر ہو گئے ہو؟

چکر دھر۔ نوکر نہیں ہوں میں منشی بجر دھر کا لڑکا ہوں۔

دھنا سنگھ نے مرعوب ہو کر کہا۔ تب تو آپ ہمارے مالک ہی ہیں۔ دھنیہ بھاگ کہ آج آپکے درشن ہوئے۔

وہ دوڑ کر گھر میں گیا اور ایک چار پائی لاکر دروازے پر ڈالدی۔ پھر لپک کر گانوں میں خبر دے آیا۔ ایک لمحہ میں گانوں کے سارے آدمی جمع ہو گئے۔ اور چکر دھر کو نذریں گذارنے لگے۔ ہر ایک زبان پر ان کی تعریف تھی۔ جب سے

سرکار آئے ہیں۔ ہمارے دن پھر گئے ہیں۔ آپ کے شیل سو بھاؤ کی جتنی تعریف سنتے تھے۔ اُس سے کہیں بڑھ کر پایا۔

دھنا سنگھ نے کہا۔ میں نے تو پہچانا ہی نہیں۔ غصہ میں نہ جانے کیا کیا بک گیا۔

دوسرا جھکا کر بولا۔ سرکار اپنا نام بتا دیتے تو ہم موٹر کو کندھے پر لاد کر لے چلتے آپ کے لئے نوجوان حاضر ہے۔ مناسنگھ مردے آدمی ہاتھ جھکا کر اُٹھ کھڑے ہو۔ تمہارے تو نصیب کھل گئے۔

مناسنگھ نے دروسے کراہ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ سرکار دیکھنے میں تو دبلے پتلے ہیں۔ پر آپکے ہاتھ پاؤں لوہے کے ہیں۔ میں نے سرکار سے بھڑنا چاہا پر آپ نے ایک ہی اڑنگے میں مجھے دے پٹکا۔

دھنا سنگھ۔ بھیا! بھاگوان کے ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں ہوتی اقبال میں طاقت ہوتی ہے۔

چکردھر کو ان تملق سازیوں میں ذرا بھی لطف نہ آیا۔ انہیں اس خیال سے ان لوگوں پر رحم آیا کہ جن نے ان کے ساتھ اتنی بے انصافی کی اسی کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں۔ ذلت کو پی جانا اخلاقی پستی کی آخری حد ہے اور یہی خوشامد سنکر ہم لٹو ہو جاتے ہیں۔ چکردھر کو اب تعجب ہو رہا تھا کہ مجھے اتنا غصہ آیا کیوں۔ سال بھر پہلے شاید وہ مناسنگھ کے پاس آکر امداد کے لئے منت سماجت کرتے۔ اگر رات بھر رہنے کی ضرورت پڑتی تو رہ جاتے۔ شاید دیہاتیوں میں ایک رات کاٹنے کا موقع پاکر خوشی ہوتی۔ آج اُنہیں تجربہ ہوا کہ ثروت کی بو کتنے بسنورا ور نامعلوم طریقے سے ان کے اندر سرایت کرتی جاتی ہے۔ کتنے سنور اور نامعلوم طریقے سے ان کی انسانیت کا اخلاق کا اور

اصولوں کا خون ہو رہا ہے۔

دفعتاً سڑک کیطرف روشنی دکھائی دی۔ ذرا دیر میں دو موٹریں سڑک پر سے جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ یکایک دونوں اسی موقع پر پہنچکر رک گئیں۔ جہاں چکر دھر کی موٹر ٹوٹی پڑی تھی۔ پھر کئی آدمی موٹروں سے اُترتے دکھائی دیئے چکر دھر سمجھ گئے کہ میری تلاش ہو رہی ہے۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ انکے ساتھ گانوں کے لوگ بھی چلے۔ قریب آکر دیکھا کہ رانی منورما پانچ مسلح سپاہیوں کے ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ چکر دھر لپک کر آگے بڑھے۔ رانی اُنہیں دیکھتے ہی ٹھٹھک گئی۔ اور گھبرا کر بولی۔ بابو جی! آپ کو کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ میری تو جیسے روح ہی فنا ہو رہی تھی۔ اب میں آپ کو تنہا کبھی نہ گھومنے دیا کروں گی۔

(۳۴)

دیو پریا کو اس غار میں رہتے کئی مہینے گذر گئے۔ وہ دل و جان سے شوہر کیخدمت میں مصروف رہتی۔ بڑے سویرے نیچے جاکر ندی سے پانی لاتی۔ پہاڑی درختوں سے لکڑیاں توڑتی اور جنگلی پھلوں کو اُبالتی۔ کبھی کبھی مہندر کمار کئی کئی دن کیلئے غائب ہوجاتے۔ دیو پریا اکیلی غار میں بیٹھی ان کی راہ دیکھا کرتی۔ مگر مہندر کو صحرانوردی سے اتنی مہلت نہ ملتی کہ دو چار لمحہ کے لئے بھی تو اسکے پاس جا بیٹھیں۔ رات کو وہ یوگ کا ابھیاس کرتے۔ نہ جانے کب کہاں چلے جاتے اور نہ جانے کب کیسے چلے آتے۔ دیو پریا کو اس کی خبر نہ ہوتی تھی۔ ان کی زندگی کا معمہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اُس غار میں بھی انہوں نے بہت سے نظر پانی آلے جمع کر رکھے تھے اور دن کو اکثر انہیں آلات سے کوئی نہ کوئی تجربہ کرتے رہتے۔ ہر ایک کام کے لئے

تو ان کے پاس وقت تھا۔ اگر وقت نہ تھا تو محض دیو پریا کی دلجوئی کے لئے۔
دیو پریا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ یہ اتنے سرد مہر کیوں ہو گئے۔ وہ شوراشوری کہاں گئی۔ وہ عاشقانہ سرگرمی کہاں غائب ہو گئی۔

وہ جنگل کے پرندوں کے ساتھ چہکتے۔ ہرنوں کے ساتھ کھیلتے۔ سانپوں کو نچاتے، ندی میں جل بہار کرتے۔ مگر محبت کے اس لازوال امتیاز میں اس کے لئے ایک مٹھی بھی نہیں! اس سے کیا خطا ہوئی ہے۔؟

حسن میں وہ لاثانی تھی۔ اس نے ایک سے ایک زاہد فریب حسینوں کو دیکھا تھا۔ مگر اپنے سامنے کوئی اس کی نگاہ میں نہ جچتی تھی۔ وہ جنگلی پھولوں کے گہنے بنا بنا کر پہنتی۔ ناز و ادا، شوخی و شرارت، عشوے و غمزے سب کچھ کرتی مگر شوہر کے دل تک رسائی نہ ہوتی۔ تب وہ جھنجلا پڑتی۔ کہ اگر یونہی جلانا تھا تو میری یہ کایا پلٹ کیوں کی۔ یہ حسن و شباب کی بلا کیوں میرے سر ڈالی۔ حسن و شباب کو پا کر ایک دن اس نے اپنے کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھا تھا۔ اسی شباب سے اب اس کا جی جلتا تھا۔

ایک دن دیو پریا نے مہندر سے کہا۔ تم نے میرا ظاہر تو بدل دیا پر باطن کیوں نہ بدلا۔

مہندر نے بے نیازی کی شان سے کہا جب تک پچھلی فروگذاشتوں کا کفارہ نہ ہو جائے دل کی کیفیت نہیں تبدیل ہو سکتی۔

ان الفاظ میں جو چاہے جو معنی پوشیدہ ہو۔ مگر دیو پریا کی سمجھ میں یہی آیا کہ یہ میری پچھلی فروگذاشتوں کے باعث مجھ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اسکا حسرت نصیب دل تڑپ اٹھا۔ آہ! یہ اتنے بے رحم ہیں۔! انہیں عفو کا حس تک نہیں تو کیا انہوں نے ان فروگذاشتوں کی سزا دینے ہی کے لئے میری یہ کایا پلٹ کی۔

کیا اُنہیں معلوم نہیں ہے کہ اس وقت میرے لئے کتنی ترغیبات تھیں۔ کیا اُنہیں میرے ساتھ اتنی ہمدردی بھی نہیں۔ یہ الفاظ اسکے دل میں تیروں کی طرح چبھنے لگے۔ زندگی سے دل بیزار ہوگیا۔ جس نعمت کا لطف اٹھانے کے لیے اُس نے اپنی ریاست ترک کر دی تھی! بھکھارن بن کر جنگل کی پتیاں چُنتی تھی۔ وہ اس کے لئے اب بھی ممنوع تھی۔ اپنے پچھلے کارناموں پر اُسے ندامت تھی۔ افسوس تھا لیکن شوہر کے مُنہ سے یہ بے رحمانہ الفاظ نہ سُننا چاہتی تھی۔ اُسنے سوچنا شروع کیا۔ کیوں نہ یہاں سے چلی جاؤں شوہر سے دور رہکر شاید وہ زیادہ خوش رہ سکتی تھی۔ دُکھتی ہوئی آنکھوں سے تو پھوٹی آنکھیں ہی اچھی۔

رات کا وقت تھا۔ مہندر غار کے باہر ایک چٹان پر پڑے ہوئے تھے۔ دیوپریا آکر بولی۔ اب سو رہے ہیں کیا؟

مہندر اُٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے۔ نہیں سو تو نہیں رہا ہوں میں ایک ایسا آلہ ایجاد کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے انسان اپنے نفس کو قابو میں رکھ سکے۔

دیوپریا۔ میں آپ سے پوچھنے آئی ہوں! جب آپ مجھے ترک کر دینا چاہتے ہیں تو کیوں سر شیوپریا کہیں اور نہیں بھیجد یتے۔

مہندر نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ میری جان۔ میں تمہیں ترک نہیں کرنا چاہتا۔ تم ہمیشہ سے میری رفیق زندگی ہو اور ہمیشہ رہو گی۔ تم اپنی حقیقت سے اُتنی آگاہ نہیں ہو۔ جتنا میں ہوں۔ میری نگاہوں میں تم آج بھی اتنی ہی پاکیزہ ہو جتنی پہلے تھیں۔ محبت کی بادشاہت میں کوئی چیز ترک کے قابل نہیں نہ کہ تم۔ جس نے میری زندگی کو منور کر دیا ہے۔

دیوپریا یہ محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ سنکر وجد میں آگئی۔ اُس کا

سارا رنج اسارا غصّہ اور سارا درد غائب ہوگیا۔ وہ اُسی چٹان پر بیٹھ گئی اور مہندر کے گلے میں باہیں ڈال کر بولی۔ تو آپ مجھ سے بولتے کیوں نہیں۔ کیوں مجھ سے بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ شوہر کی اُلفت ہی عورت کی زندگی کا سہارا ہے۔ اِس سہارے کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔

مہندر نے دردناک لہجہ میں کہا۔ دیوی بہت اچھا ہوتا کہ تم نے مجھ سے یہ سوال پوچھا ہوتا۔ میں جو کچھ کہوں گا اس سے تمہارے دل کو اور بھی صدمہ ہوگا میرے اندر کی آگ باہر نہیں نکلتی۔ اِس سے یہ نہ سمجھو کہ وہ جلانا نہیں جانتی۔ آہ! اس لازوال محبت کی یادگاریں ابھی میرے دل میں تازہ ہیں جنکا لطف اٹھانیکا حسنِ اتفاق مجھے بہت تھوڑے دنوں کے لئے ہوا تھا۔ اُسی مسرت کی تمنا مجھے تمہارے دروازے کا گداگر بنا کر لے گئی تھی۔ مگر کیا جانتا تھا کہ زمانہ میرے ارادوں کا مذاق اڑا رہا ہے۔ جس وقت میں تمہاری طرف آرزومند نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ تو میری آنکھوں میں جلن ہونے لگتی ہے۔ جب میں تمہیں طلوعِ سحر کے وقت آنچل میں پھول بھرے روشنی کی بارش کرتے ہوئے آتے دیکھتا ہوں۔ تو میرے دل میں جو ہیجان ہوتا ہے۔ اس کا تم اندازہ بھی نہیں کرسکتیں۔ تمہیں یاد ہے۔ ایک دن میں نے تمہارا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جلتے توے پر ہاتھ پڑ گیا۔ اس کا کیا سبب ہے۔ کیوں تقدیر ہم میں جدائی کا پردہ ڈال رہی ہے۔ یہ میں نہیں جانتا۔ پر میرے دل میں کوئی غیب کی صدا آتی ہے کہ یہ میری ہوس پروری کی سزا ہے۔

عورتوں کی فراست مشہور ہے۔ مہندر کی سمجھ میں جو بات نہ آئی تھی۔ وہ دیو پریا سمجھ گئی۔ اُس دن سے وہ تپسونی بن گئی۔ شوہر کے سایہ سے بھی [illegible] کرتی۔ اگر وہ اسکے کمرے میں آجاتے تو ان کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھتی

پر وہ اِس حالت میں بھی خوش تھی۔ عورت کا دل خدمت کے لطیف ذرّوں سے مرکب ہوتا ہے۔ اس کی محبت بھی خدمت ہے۔ اس کی حکومت بھی خدمت ہے یہاں تک کہ اس کا غصہ بھی خدمت ہے۔ دیو پریا نے اپنے دِل کے سارے جذبات خدمت کے قربان گاہ پر نثار کر دیئے۔ اس کی خدمت کی حد وہیں تک تھی۔ جہاں محبت کا آغاز ہوتا ہے اور وہ قسم کھانے کو تیار تھی۔ کہ اُس نے شوہر کی محبت کا اتنا ہی لطف اُٹھایا ہے۔ جتنا ایک بیوہ اٹھا سکتی ہے۔

ایک دن مہندر نے آکر کہا۔ دیوی، چلو آج تمہیں عالم بالا کی سیر کرا لاؤں۔ آج میرا ہوائی جہاز تیار ہو گیا۔

مہندر نے یہ جہاز سات برس کی متواتر کوشش سے تیار کیا تھا۔ اسمیں یہ صفت تھی کہ باد اور باراں بھی مستقل انداز سے اُڑا جاتا تھا۔ گویا فطرت کی طاقتوں پر فتح کا نقارہ بجا رہا ہو۔ اسپر بیٹھ کر وہ دُنیا کی ہر ایک شے کو اسکی حقیقی صورت میں دیکھ سکتے تھے۔ ابتک مہندر نے کبھی دیو پریا سے اس پر بیٹھنے کا اِصرار نہ کیا تھا۔ ان کے مُنہ سے جہاز کے اوصاف سُن سنکر اس کا جی تو چاہتا تھا۔ کہ ایک بار اسمیں بیٹھ کر سیر کروں۔ پر وہ ضبط کر جاتی تھی۔ آج بھی اُس نے اپنے اشتیاق کو گویا پتھر کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ آپ جاکر عالم بالا کی سیر کیجئے۔ میں اپنے گوشہ عافیت میں ہی مگن ہوں۔

مہندر۔ اِنسانی عقل نے اب تک جتنی ایجادیں کی ہیں ۔ کامل ظہور نظر آجائے گا۔

دیو پریا۔ آپ جایئے میں نہیں جاتی۔

مہندر۔ میں آج تمہیں زبردستی لے چلوں گا۔

یہ کہہ کر انہوں نے دیو پریا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنی طرف کھینچا۔ دیو پریا کا

دل ڈانواڈول ہوگیا۔ غار کے باہر سونے کی بارش ہورہی تھی۔ آسمان اور زمین پر سنہرا جادو چھایا ہوا تھا۔ جہاز ایک لمحہ میں دونوں سواروں کو لے کر آسمان کیطرف اڑا۔ وہ سیدھا چاند کیطرف چلا جاتا تھا۔ اوپر! اوپر! اور بھی اوپر! یہاں تک کہ چاند کی وسعت اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی دیکھ کر دیو پریا خائف ہوگئی۔

یکایک وہ ایک نغمہ کی صدائے شیریں سنکر چونک پڑی اور بولی، یہاں کون گا رہا ہے۔

مہندر نے مسکرا کر کہا۔ ہمارے سوامی جی ایشور کے حمد کے گیت گا رہے ہیں۔

جہاز اور بھی اوپر اڑتا چلا جاتا تھا۔ جو تارے زمین پر سے ٹمٹماتے ہوئے نظر آتے تھے وہ اب چندرما کی طرح نورانی ہو گئے تھے۔ اور چندرما اپنی وسعت سے دس گنا بڑا نظر آتا تھا۔ کائنات پر کامل سکون چھایا ہوا تھا۔ صرف دیو پریا کے سینے میں دھڑکن ہو رہی تھی۔ وہ کسی نامعلوم خوف سے کانپ رہی تھی۔

تب مہندر نے بینا اٹھائی اور دیو پریا سے بولے۔ پیاری، تمہارا جادو بھرا گانا سنے ہوئے ایک مدت گذر گئی۔ یاد ہے تم نے کب گایا تھا۔ وہی گیت آج پھر گاؤ۔ دیکھو تارے کان لگائے بیٹھے ہیں۔

دیو پریا شوہر کی فرمائش کو نہ ٹال سکی۔ اُسے کچھ ایسا گمان ہوا کہ یہ ان کی آخری فرمائش ہے۔ ان کانوں سے وہ پھر ان کی باتیں نہ سنیں گی۔ اُسنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بینا اٹھائی اور تھرائی ہوئی آواز میں گانے لگی

پریا ملن ہے کٹھن باوری،

حسرت اور یاس میں ڈوبی ہوئی یہ متوالی راگنی سنتے ہی مہندر کی آنکھوں سے

آنسو جاری ہو گئے۔ ان چند لفظوں میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ ان پر بے خودی کا عالم طاری ہو گیا۔ ان کے دل میں ایک بیتاب کن خواہش جس میں جنون کی شدت تھی بیدار ہو گئی۔ دفورِ شوق سے بیتاب دل نے کہا کہ یہ پابندیاں کب تک۔ یہ انتظار کب تک، یہ ضبط کب تک۔ اس زندگی کا بھروسہ ہی کیا۔ نہ جانے کب اس کا خاتمہ ہو جائے اور یہ خون دل سے پلی ہوئی تمنائیں خاک میں مل جائیں۔

ایک ہیبت ناک خموشی چھائی ہوئی تھی اور جہاز ہر لمحہ اوپر اور اوپر چڑھتا جاتا تھا۔ مہندر نے دیو پریا کا نازک ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولے۔ جانِ من! آج ہمارے فراق کا خاتمہ ہے۔

دیو پریا کے ہاتھوں سے بینا چھوٹ کر گر پڑی۔ اس نے دیکھا مہندر کے پھڑکتے ہوئے ہونٹھ اس کے رخساروں کے پاس آ گئے ہیں۔ ان کے تنفس میں شدت پیدا ہو گئی ہے اور ان کے دونوں ہاتھ مستی سے بھرے ہوئے اُسے آغوش میں لینے کے لئے بڑھے آ رہے ہیں۔ دیو پریا ایک لمحہ کے لئے صرف ایک لمحہ کے لئے سب کچھ بھول گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ مہندر کے گلے میں جا پڑے۔

یکایک دھماکے کی آواز آئی۔ دیو پریا کا کلیجہ دہل اٹھا۔ اُسے معلوم ہوا جہاز تباہ کن سرعت سے نیچے چلا جا رہا ہے۔ اُس نے اپنے کو مہندر کے آغوش سے علیحدہ کر لیا۔ اور وحشت کی حالت میں بولی۔ پران ناتھ۔ پران ناتھ! کیا ہم تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔

مہندر نے کچھ جواب نہ دیا۔

دیو پریا نے پھر کہا۔ ایشور کے لئے اِسے روکئے۔ میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔

مہندر نے کرب کی حالت میں کہا۔ دیوی اب اِسے روکنا میری قدرت کے

باہر ہے۔ میرے جسم میں ایک جمود سا دوڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ شاید یہ میری حیات کے آخری لمحے ہیں۔ آہ! میں گرا جا رہا ہوں۔

دیو پریا انہیں سنبھالنے چلی تھی۔ کہ دھندر گر پڑے۔ اس نزع کی حالت میں یہ الفاظ انکے منہ سے نکلے دیوی! ہم اور تم پھر ملیں گے۔ ضرور ملیں گے۔ یہ آرزو۔ یہ تشنہ آرزو مجھے پھر تمہارے پاس کھینچ لائے گی۔ غیب کے بے درد ہاتھ بھی اسے نہیں روک سکتے۔

دیو پریا کھڑی رو رہی تھی اور جہاز تیزی سے نیچے گر رہا تھا۔

(۳۵)

چکردھر کو رات بھر نیند نہ آئی۔ زندگی میں یہ پہلا ہی موقع تھا کہ انہوں نے ایک بیکس کو ایذا پہونچائی تھی۔ جس کی ساری زندگی بیکسوں کی حمایت میں گذری ہو اس میں یہ کایا پلٹ اخلاقی تباہی سے کم نہ تھی۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ ثروت نے بالآخر ان کی انسانیت پر فتح پائی۔

وہ تو اس فکر میں ڈوبے ہوئے تھے اور اہلیا اپنے آراستہ خوابگاہ میں مخملی گدے پر لیٹی انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اتنے میں شنکدھر لڑھکتا ہوا آکر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اہلیا نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ بیٹا ذرا میری گود میں آجاؤ۔

شنکدھر نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ ہم نہیں آتے۔

اہلیا۔ دیکھو میں تمہاری اماں ہوں۔

شنکدھر۔ تم اماں نہیں۔ اماں لائی ہے۔

اہلیا۔ کیا میں رانی نہیں ہوں۔

شنکدھر نے اسے حیرت سے دیکھ کر کہا۔ تم لانی نہیں۔ اماں لانی ہے۔

اہلیا نے چاہا کہ لڑکے کو پکڑ لے۔ پر وہ تم لانی نہیں، تم لانی نہیں کہتا ہوا کمرہ سے نکل گیا۔ بات کچھ نہ تھی۔ لیکن اہلیا نے اس میں کچھ اور ہی معنی بٹھائے۔ اس کی دانست میں یہ بھی منورما کی ایک چال تھی۔ کہ چکردھر نے کمرے میں قدم رکھا۔ انہیں دیکھتے ہی اہلیا ٹھٹھک گئی۔ اور تیوریاں چڑھا کر بولی۔ اب تو رات رات بھر آپ کے درشن نہیں ہوتے۔

چکردھر۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے۔ آدھ گھنٹہ تک جگاتا رہا۔ جب تم نہ جاگیں تو چلا گیا۔ یہاں آکر تم سونے میں مشاق ہوگئیں۔

اہلیا۔ باتیں بناتے ہو۔ میں بارہ بجے تک جاگتی رہی۔ اب مجھے ایک اور فکر پیدا ہوئی۔

چکردھر۔ اب تک جتنی فکریں ہیں۔ تب تو تمہاری نیند کا یہ حال ہے۔ یہ نئی فکر پیدا ہوئی تو شاید تمہاری آنکھیں ہی نہ کھلیں ؛

اہلیا۔ کیا میں سچ مچ بہت سوتی ہوں؟

چکردھر۔ اچھا، ابھی تمہیں اس میں شک بھی ہے؟ گھڑی میں دیکھو آٹھ بج گئے ہیں۔ تم پانچ بجے اُٹھ کر کام دھندھا کرنے لگتی تھیں۔

اہلیا۔ تب کی باتیں جانے دو۔ اب اتنے سویرے اُٹھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

چکردھر۔ تو کیا تم عمر بھر یہاں مہمان رہوگی؟

اہلیا نے تعجب میں آکر پوچھا، اس کا کیا مطلب؟

چکردھر۔ اس کا مطلب یہی ہے۔ کہ ہمیں یہاں آئے بہت دن گذر گئے اب اپنے گھر چلنا چاہیئے۔

اہلیا۔ اپنا گھر کہاں ہے۔

چکردھر۔ اپنا گھر وہی ہے۔ جہاں اپنے ہاتھوں کی کمائی ہو۔

اہلیا نے کچھ سوچ کر کہا۔ للّو کہاں رہے گا۔

چکردھر۔ للّو کو یہیں چھوڑ سکتی ہو۔ وہ رانی منورما سے خوب ہل گیا ہے تمہاری تو شاید اُسے یاد بھی نہ آئے۔

اہلیا۔ اچھا تو اب سمجھ میں آیا۔ اس لئے رانی اُسے اتنا پیار کرتی ہیں یہ بات تم نے خود سوچی ہے یا رانی نے کچھ کہا ہے؟

چکردھر۔ بھلا وہ کیا کہیں گی۔ میں خود یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ تمہارا گھر ہے تم رہ سکتی ہو۔ لیکن میں نے تو یہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اہلیا نے غرور سے سر اٹھا کر کہا۔ تم نہ ہوگے تو یہاں رہ کر مجھے کیا لینا ہے جب چاہے چلو! ہاں دادا جی سے پوچھ لو۔ مگر اتنا سوچ لو کہ ہم لوگوں کے جانے ہی یہاں کا سارا انتظام خراب ہو جائے گا۔ رانی منورما کا حال دیکھ رہی ہو۔ روپے کو ٹھیکری سمجھتی ہیں۔ تھوڑے دنوں میں ریاست برباد ہو جائیگی۔ اور ایک دن بچارے للّو کو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔

اہلیا کا دلی منشا ان الفاظ سے صاف ٹپک رہا تھا۔ چکردھر سمجھ گئے کہ اگر میں اصرار کروں تو یہ میرے ساتھ جانے پر آمادہ ہو جائے گی۔ جب ثروت اور وفاداری کا مقابلہ ہوگا تو وہ کس طرف مائل ہوگی۔ اس میں شمہ برابر بھی شک نہ تھا۔ لیکن وہ اُسے سخت آزمائش میں ڈالنا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ شنکدھر کو اس سے جدا کر دینا اتنا بڑا ستم تھا۔ جو وہ اس پر روا نہ رکھتے تھے۔

منورما اس وقت شنکدھر کو لئے باغیچہ کی طرف جاتی ہوئی ادھر سے نکلی۔ چکردھر کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی اور بولی۔ رات کو سوئے نہیں کیا آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں۔

چکردھر۔ نیند ہی نہیں آئی۔ اسی ادھیڑبن میں پڑا تھا کہ رہوں یا جاؤں۔

منورما نے متفکر ہو کر پوچھا۔ کب تک لوٹئے گا۔؟

چکردھر۔ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن جلد لوٹنے کا ارادہ نہیں ہے۔

رانی نے مسکرا کر کہا۔ مجھے بھی لیتے چلئے۔

چکردھر نے حسرت سے کہا۔ یہ تو ہونا ہی نہیں تھا منورما رانی۔ تم پہلے بھی میرے لیے دیوی تھیں۔ اب بھی دیوی ہو۔

منورما۔ باتیں نہ بناؤ بابوجی۔ تم مجھے ہمیشہ دھوکا دیتے آئے ہو اور اب بھی وہی رسم نبھا رہے ہو۔ پہ سچ کہتی ہوں مجھے بھی لیتے چلو۔ اچھا اگر میں راجہ صاحب کو راضی کر لوں۔ تب تو تمہیں کوئی عذر نہ ہوگا۔

چکردھر۔ غیر ممکن۔

منورما۔ کیوں۔

چکردھر۔ بہت سی باتوں کا مطلب بغیر تشریح کے بھی واضح ہو جاتا ہے۔

منورما۔ شاید آپ سمجھتے ہونگے۔ کہ میں یہ عیش چھوڑ کر نہ جا سکوں گی۔ اگر ایسا ہے تو آپ نے اب بھی مجھے نہیں سمجھا۔ میں ثروت کے مزے اٹھانے کے لئے یہاں نہیں آئی تھی۔ میں ایشور کو درمیان دیکر کہتی ہوں۔ میں نے کبھی عیش کی غلامی نہیں کی۔ دولت مجھے عزیز ہے۔ لیکن اسی لئے کہ میں اس سے کچھ خدمت کر سکتی ہوں۔ یا خدمت کرنے والوں کی کچھ مدد کر سکتی ہوں۔ سچ کہا ہے۔ مرد کتنا ہی عالم، عقلمند اور تجربہ کار ہو، عورت کو سمجھنے میں ہمیشہ دھوکا کھاتا ہے۔ اہلیہ نے کیا فیصلہ کیا؟

چکردھر۔ وہ تو میرے ساتھ جانے کو تیار ہیں۔

منورما۔ کون؟ اہلیا؟ وہ آپ کے ساتھ نہیں جا سکتیں۔ اور آپ سے گئے

تو آج کے تیسرے دن یہاں پونچنا پڑے گا۔ میں وہی ہوں جو تھی، وہ اپنے دن بھول گئیں۔

یہ کہتے ہوئے منورما نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور خراماں خراماں بغیچہ کی طرف چلی گئی۔ چکردھر کھڑے سوچ رہے تھے۔ کیا واقعی میں نے اُسے نہیں سمجھا۔ دفعتاً اُنہیں ایک بات یاد آ گئی۔ لپک کر منورما کے پاس جا پہونچے اور بولے میں آپ سے ایک عرض کرنے آیا ہوں۔ دھنا سنگھ کے ساتھ میں نے جو بے رحمی کی ہے اس کا کچھ کفارہ کرنا چاہتا ہوں۔

منورما نے مسکرا کر کہا۔ بہت دیر میں اسکی سدھ آئی۔ میں نے اسکی کل چوٹ معاف کر دی ہے۔

چکردھر نے حیرت میں آکر کہا۔ اِس لئے میرا جی چاہتا ہے کہ آپکی پرستش کروں تو میں جاکر اُسے اطلاع دے دوں۔

منورما۔ اِس ذراسی بات کے لئے آپ کا جانا آپ کی شان کے خلاف ہے تو آپ نے کب جانے کا فیصلہ کیا۔

چکردھر۔ آج ہی رات کو۔

منورما نے طنز آمیز تبسم سے کہا۔ ہاں اِس وقت اہلیا دیوی سوتی بھی ہونگی۔

ایک لمحہ کے بعد وہ پھر بولی۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو سب کچھ چھوڑ کر آپ کے ساتھ چلتی۔

یہ کہتے کہتے منورما کا چہرہ شرم کی سُرخی سے گلنار ہو گیا۔ جو بات وہ دھیان میں بھی نہ لانا چاہتی تھی وہ اس کے منہ سے نکل گئی۔ وہ تیزی سے باغ کیطرف چلی گئی۔ شاید ڈرتی تھی کہ اسکے منہ سے کوئی اور بے موقع بات نہ نکل جائے۔

جیوں جیوں شام قریب آتی تھی۔ چکر دھر کا دل تشویش سے دبا جاتا تھا۔ پہلے کہیں باہر جانے میں جو سرگرمی ہوتی تھی۔ اب اس کا نام بھی نہ تھا جانتے تھے۔ کہ چھلکے ہوئے دودھ پر آنسو بہانا بیکار ہے۔ مگر اس وقت بار بار جشودانندن مرحوم پر غصہ آرہا تھا۔ اگر انہوں نے اسکے گلے میں یہ پھندا نہ ڈالا ہوتا تو آج اس کی کیوں یہ حالت ہوتی۔ وہ تو کسی راجہ کی لڑکی سے شادی کرنے کا آرزومند نہ تھا۔ قدرت کو اُسی کے ساتھ یہ قاتل مذاق کرنا تھا۔

شام کو وہ راجہ صاحب سے اجازت لینے گئے۔ راجہ صاحب نے چشم پُر آب سے پوچھا۔ آپ دھن کے پکے آدمی ہیں۔ میری کیوں سُننے لگے۔ مگر میں اتنا کہے دیتا ہوں کہ اہلیا رو رو کر جان دے دیگی۔ اور اگر آپ شنکدھر کو بھی لے گئے تو میری سونے کی لنکا خاک میں مِل جائے گی۔ پھر اس راج کو کون سنبھالے گا۔

چکر دھر۔ حکومت میری زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ پھر تو آپ تو ہیں ہی۔

راجہ۔ تم سمجھتے ہو میں بہت دن جیوں گا۔ سکھی آدمی بہت دن نہیں جیتے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ کہ اب چلنے کے دن قریب ہیں۔ وہ لو شنکدھر تلوار لیے دوڑا آرہا ہے۔ کیوں بیٹا! تلوار کیوں لاتے ہو۔

شنکھدھر۔ تم کو ماریں گے۔

راجہ۔ کیوں بھائی میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔

شنکدھر۔ اماں لاتی روتی ہیں۔ تم نے ان کو مارا ہے۔

راجہ۔ لو صاحب۔ یہ ایک نیا الزام میرے سر مڑھا جا رہا ہے۔ چلو ذرا دیکھوں تمہاری لانی اماں کو کس نے مارا ہے۔

شنکدھر۔ بلی ڈیل سے روتی ہیں۔

راجہ صاحب فوراً اندر چلے گئے۔ دیکھا تو منورما سچ مچ رو رہی ہے۔ بیتاب ہو کر پوچھا۔ کیا بات ہے نورا کیسا جی ہے!

منورما نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ اچھی تو ہوں۔

راجہ۔ تو آنکھیں کیوں لال ہیں۔

منورما۔ اہلیا بابو جی کے ساتھ جا رہی ہیں۔ للّو کو بھی لے جائینگی۔

راجہ۔ اہلیا نہیں جا سکتی۔

منورما۔ آپ بابو جی کو کیوں نہیں سمجھاتے۔

راجہ۔ وہ میرے سمجھانے سے نہ مانیں گے۔ انہیں جانے دو۔ مجھے تو بشواس ہے۔ وہ بہت دن باہر نہ رہیں گے۔

منورما کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ بولی۔ وہ اب یہاں نہ آئینگے۔ آپ انہیں نہیں جانتے۔

ادھر چکر دھر نے سوچا۔ اس طرح تو شاید میں یہاں سے مر کر بھی فرصت نہ پا سکوں۔ مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا۔ جب تنہا ہی جانا ہے تو کیا غم۔ اپنے کمرے میں جا کر دو چار کپڑے اور کچھ کتابیں سمیٹ کر رکھدیں کُل اتنا ہی سامان تھا جو ایک آدمی آسانی سے ہاتھ میں لٹکا کے لئے چلے۔

آج انہیں کھانے میں ذرا بھی مزہ نہ آیا۔ وہ اہلیا سے بھی نہ ملنا چاہتے تھے۔ لیکن پھر دل کو سمجھایا۔ میرا اس سے روٹھنا انصاف سے بعید ہے وہ اگر اپنے لڑکے کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تو کوئی غیر معمولی کام نہیں کرتی ایسے فاسد خیالات کو دل میں جگہ دینا ہی انہیں شرمناک معلوم ہوا۔

سفر کی تیاری کر کے اور اپنے دل کو سمجھا کر چکر دھر نے اپنے خوابگاہ میں آرام کیا۔ تاکہ شبھ بے دست و پا ہو جائے۔

اہلیا نے کہا۔ دادا جی تو راضی نہ ہوتے۔

چکردھر نے بات بنائی۔ انہیں ناراض کرنا تو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اہلیا خوش ہوکر بولی میں شنکدھر کو لے کر چلی جاتی تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔

چکردھر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ نیند کا بہانہ کرنے لگے۔ وہ چاہتے تھے کہ اہلیا سو جائے تو اپنا بقچہ اٹھاؤں اور رملیا ہو جاؤں۔ مگر آج اہلیا کی آنکھوں سے بھی نیند کوسوں دور تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی ذکر چھیڑ کر باتیں کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب آدھی رات سے زیادہ گذر گئی۔ تو چکردھر نے کہا بھائی اب مجھے سونے دو۔ آج تمہاری نیند کہاں بھاگ گئی۔

گرمی کے دن تھے۔ کمروں میں پنکھا چل رہا تھا۔ پھر بھی گرمی معلوم ہوتی تھی۔ روزن کواڑ کھلے رہتے تھے۔ آج اہلیا نہ جانے کیوں بہت محتاط ہو گئی تھی سمجھتی نہیں جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔

رات بھیگ چکی تھی۔ ذرا دیر میں اہلیا مدہوش خواب ہو گئی۔ چکردھر کا بے پیر دل اہلیا کے اس احتیاط پر بے تاب ہو گیا۔ اس خیال سے انکا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ کہ جب صبح اہلیا انہیں نہ پاوے گی۔ تو اس کی کیا حالت ہو گی۔ ادھر کچھ دنوں سے اہلیا کو ثروت کے مزے اٹھاتے دیکھ کر چکردھر کو گمان ہونے لگا تھا۔ کہ اس کی محبت میں گرمی باقی نہیں رہی۔ مگر آج اس کا اضطراب دیکھ کر ان کے وہ شبہات فنا ہو گئے۔ جب کوئی چیز ہمارے ہاتھ سے جانے لگتی ہے۔ تب ہمیں اس کی قدر ہوتی ہے۔ اطمینان کی حالت میں ہم عزیز ترین چیزوں کی طرف سے بھی غافل ہو جاتے ہیں۔

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چکردھر نے اٹھ کر دروازوں کو

ٹٹولنا شروع کیا۔ مگر سمتوں کا اندازہ اتنا خطا کر رہا تھا کہ کبھی سپاٹ دیوار ہاتھ میں آتی، کبھی کوئی کھڑکی، کبھی کوئی میز۔ حافظہ پر زور ڈال رہے تھے کہ میں کس طرف منہ کر کے سویا تھا۔ لیکن عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ آخر انہوں نے دیواروں کو ٹٹول کر بجلی کا بٹن ڈھونڈھ نکالا اور بتی جلادی۔ دیکھا اہلیا خواب نوشیں کے مزے لے رہی ہے۔ کیا حسن تھا۔ جس میں نیند نے اور بھی لطافت اور تازگی پیدا کر دی تھی۔

چکردھر کے دل میں آیا کہ اہلیا کو جگا دیں اور خوشی خوشی رخصت ہوں پر چوروں کی طرح جاتے ہوئے انہیں صدمہ ہو رہا تھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر انہوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ انہیں اگر نکل بھاگنے ہی کی دھن ہوتی تو اس کا کافی موقع تھا۔ لیکن اس وقت تعلقات کی زنجیریں سخت پڑ گئی تھیں۔ جی چاہتا تھا شنکھدھر کو ایک بار پیار کر لینے کی خواہش نے انہیں بے تاب کر دیا۔ وہ زینے کی طرف چلے۔ اہلیا سوئی تو تھی۔ مگر اسے کھٹکا لگا ہوا تھا۔ یہ آہٹ پاتے ہی اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا کہاں بھاگے جاتے ہو۔

چکردھر نے یہ آواز سنی تو خون سرد ہو گیا۔ اوپر نہ جا کر کمرے میں آ گئے۔ اور دلجویانہ انداز سے بولے۔ کیا تمہاری نیند کھل گئی۔؟

اہلیا۔ میں سوئی کب تھی؟ میں جانتی تھی کہ تم آج جاؤ گے۔ تمہارا چہرہ کہے دیتا تھا کہ تم آج مجھ سے دغا کرو گے۔ میں تم سے کہے دیتی ہوں، یوں مجھے فریب دیکر تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ مجھے راج کی پرواہ نہیں ہے۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ تم اتنے بے رحم ہو مجھے نہ معلوم تھا۔ یہ بدیا تم نے کب سے سیکھی۔ مجھے چھوڑ کر جاتے ہوئے تمہیں ذرا بھی درد نہیں آتا۔

چکردھر نے شرمندہ ہو کر کہا۔ میرے ساتھ تمہیں بہت تکلیف ہوگی اہلیا۔

ایشور نے چاہا تو میں جلدی لوٹوں گا۔

اہلیا نے دردناک لہجہ میں کہا۔ میں نے تمہارے ساتھ کونسی تکلیفیں نہیں جھیلیں۔ اور ایسی کونسی مصیبت ہے۔ جو میں نے برداشت نہیں کی۔ میں ثروت کی لونڈی نہیں ہوں۔ کہ ایشور نے جو چیز دی ہے۔ اُسے کیوں چھوڑ دوں۔

چکردھر۔ اور شنکھدھر؟

اہلیا۔ اُسے بھی لے چلوں گی۔

چکردھر۔ رانی اُسے جانے دیں گی؟ جانی ہو راجہ صاحب کا کیا حال ہوگا۔

اہلیا۔ یہ سب تو تم بھی جانتے ہو۔

چکردھر۔ خلاصہ یہ کہ تم مجھے نہ جانے دو گی۔

اہلیا۔ ہاں تو مجھے چھوڑ کر تم نہیں جا سکتے۔ اور نہ میں ہی للو کو چھوڑ سکتی ہوں۔

اوپر کے کمرے سنورما کے تھے۔ ان باتوں کی کچھ بھنک ان کے کانوں میں پڑی۔ وہ بھی ابھی تک نہ سوئی تھی۔ اُس نے دربان کو تاکید کر دی تھی۔ کہ رات کو چکردھر جانے لگیں تو مجھے اطلاع دینا۔ وہ اپنے من کی دو چار باتیں چکردھر سے کہنا چاہتی تھی۔ وہ نیچے اُتری تو اہلیا کے آخری الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے۔ اُس نے دیکھا چکردھر ٹھس دیوار بنے کھڑے ہیں۔ اُسے خوف ہوا کہ ان ترغیبوں میں پڑ کر کہیں وہ اپنے مسلک سے ہٹ نہ جائیں۔ وہ چکردھر کو ایثار کا دیوتا سمجھتی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ چکردھر کو ثروت کی رتی برابر بھی پرواہ نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہاں رہنا اُنکے لئے مشکل ہے۔ اُس نے طے کیا۔ کہ شنکھدھر کی محبت میں پڑ کر وہ ان کی آزادی میں مخل نہ ہوگی۔ جس لڑکے سے نام کا رشتہ ہونے پر اُسے اتنی محبت ہے اُس سے اُنہیں کتنی محبت ہوگی۔ وہ شنکھدھر کے لئے روئے گی تڑپے گی۔ لیکن چکردھر کو بیٹے کی جدائی کے

عذاب میں نہ ڈالے گی۔ وہ ان کے چراغ سے اپنا گھر روشن نہ کرے گی۔ دم زدن میں اُس نے یہ فیصلہ کر لیا۔ اور نیچے آکر بولی۔ بابو جی آپ میرا خیال نہ کیجئے۔ للو کو لیتے جائیے۔ آخر آپ کا دل وہاں کیسے لگے گا۔ مجھے کون جیسے پہلے رہتی تھی۔ ویسے ہی پھر رہوں گی۔ ہاں اتنا خیال رکھئے گا کہ کبھی کبھی اسے لاکر مجھے دکھا دیجئے گا۔

یہ کہتے کہتے منورما کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

چکر دھر نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ وہ بھلا آپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ کیوں جانے لگا۔

منورما۔ یہ میں کیسے کہوں۔ ماں باپ لڑکے کے ساتھ جتنی محبت کر سکتے ہیں اُتنی اور کون کر سکتا ہے۔

اہلیا۔ تلملا اُٹھی۔ شوہر کو روکنے کے لئے اس کے پاس یہی ایک بہانہ تھا۔ وہ نہ جانا چاہتی تھی نہ چکر دھر کو جانے دینا چاہتی تھی۔ لیکن جب رانی نے یہ آلہ اُسکے ہاتھ سے چھین لیا۔ تو اُسے اندیشہ ہوا کہ اِس میں کچھ نہ کچھ راز ضرور ہے ترش ہو کر بولی۔ تو کیا یہ سب دکھاوے کی محبت تھی۔ آپ تو کہتی تھیں یہ میری جان ہے۔ میرا لخت جگر ہے۔ کیا ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے سارا سوانگ رچا تھا۔ اب ہم لوگوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر راج کرنا چاہتی ہیں۔ یہ نہ ہوگا۔ دادا کو آپ کوئی دوسرا منتر نہ پڑھا سکیں گی۔ اگر آپ نے سمجھ رکھا ہے کہ اِن سبھوں کو پھٹکار کر اپنے کسی بھائی بھتیجہ کو یہاں لا بٹھاؤ نگی تو وہ سارے منصوبے خاک میں ملجا وینگے۔

یہ کہکر اُسی طیش کی حالت میں اہلیا راجہ صاحب کے خوابگاہ کیطرف چلی منورما مفلوج سی کھڑی رہگئی۔ اسکے آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اہلیا کے اِن کلماتِ سخت نے منورما سے زیادہ چکر دھر کو صدمہ پہونچایا۔ منورما

وہ ایک بار پہلے بھی اہلیا کے منہ سے ایسی باتیں سُن چکی تھی۔ اور اُس کی عادت سے واقف ہو گئی تھی۔ چکر دھر کو ایسی باتیں سُننے کا یہ پہلا ہی اتفاق تھا۔ وہی اہلیا جسے وہ انکسار، شرافت اور شرم و حیا کی دیوی سمجھتے تھے۔ دیوی بنی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اُنہیں اتنا ملال ہوا کہ اسی وقت زمین پھٹ جائے اور میں اسمیں سما جاؤں۔ نہ اسکا منہ دیکھوں اور نہ اپنا دکھاؤں۔ اُنہیں ایسا محسوس ہوا کہ میرے منہ میں کالکھ لگی ہوئی ہے۔ منورما ابھی سر جھکائے کھڑی ہی تھی کہ چکر دھر چپکے سے باہر کے کمرے میں آئے۔ اپنا ہینڈ بیگ اُٹھایا اور باہر نکلے۔

دربان نے پوچھا۔ سرکار اس وقت کہاں جا رہے ہیں۔

چکر دھر نے لاپرواہی سے کہا۔ ذرا میدان کی ہوا کھانا چاہتا ہوں بھیتر بڑی گرمی ہے۔ نیند نہیں آتی۔

دربان۔ میں بھی سرکار کے ساتھ چلوں۔

چکر دھر۔ نہیں کوئی ضرورت نہیں۔

باہر آکر چکر دھر نے محل کی طرف نظر ڈالی۔ بے شمار کھڑکیوں اور دریچوں سے بجلی کی شفاف روشنی چھانک رہی تھی۔ اُنہیں وہ محل ہزاروں آنکھوں والے دیو کی طرح معلوم ہوا۔ جس نے ان کی زندگی کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اُنہیں ایسا معلوم ہوا کہ وہ اُن کی طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے اور کہہ رہا ہے "کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے چلے جانے سے یہاں کسی کو رنج ہوگا۔ یہاں بھی بہار رہے گی۔ یوں ہی چین کی بنسی بجے گی۔ تمہارے لئے کوئی دو بوند آنسو بھی نہ بہائے گا۔ جو لوگ میرے سایہ میں آتے ہیں۔ ان کی اندرونی آنکھیں اس روشنی میں بے نور ہو جاتی ہیں۔ اور ان کا ضمیر فنا ہو جاتا ہے۔

(۳۶)

پانچ سال گذر گئے پر چکردھر کا کچھ پتہ نہیں۔ پھر وہی گرمی کے دن ہیں۔ دن کو تو جلتی ہے۔ رات کو انگارے برستے ہیں۔ مگر اہلیا کو اب نہ پنکھے کی ضرورت ہے نہ خس کی ٹٹیوں کی۔ اُس دکھیا کو اب رونے کے سوا دوسرا کام نہیں ہے۔ تکلف کی کسی چیز سے اُسے رغبت نہیں۔ منورما سے اب اس کا وہ برتاؤ نہیں رہا۔ منورما ہی کیوں، لونڈیوں سے بھی وہ انسانیت سے پیش آتی ہے اور شنکدھر کے بغیر تو اب وہ لمحہ بھر نہیں رہ سکتی۔

شنکدھر اُس سے پوچھتا رہتا ہے، اماں! بابو جی کب آئیں گے؟ وہ کیوں چلے گئے؟ آتے کیوں نہیں۔ تم نے ان کو کیوں جانے دیا؟ تم نے مجھے ان کے ساتھ کیوں نہیں جانے دیا؟ تم ان کے ساتھ کیوں نہیں چلی گئیں اماں بتاؤ؟ بیچارے وہاں اکیلے پڑے ہوں گے۔ میں بھی ان کے ساتھ جنگلوں میں گھومتا کیوں اماں انہوں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں؟ رانی اماں کہتی ہیں۔ وہ آدمی نہیں دیوتا ہیں۔ تب تو لوگ ان کی پوجا کرتے ہوں گے۔

اہلیا کے پاس ان سوالات کا جواب رونے کے سوا اور کیا تھا۔ شنکدھر کبھی کبھی بیٹھ کر روتا ہے۔ اور سوچتا ہے بابو جی کے پاس کیسے جاؤں۔ باپ کا ذکر سُننے سے اس کی طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ وہ روز اپنی دادی کے پاس جاتا ہے اور وہاں ان کی گود میں بیٹھا ہوا چکردھر کا ذکر سُنتا ہے۔ چکردھر کی کتابوں کو وہ روز اُلٹتا پلٹتا ہے اور چاہتا ہے۔ میں بھی بڑا ہو جاؤں اور یہی کتابیں پڑھنے لگوں۔ نرملا دن بھر اس کی راہ دیکھا کرتی ہے۔ مگر اہلیا کے نام سے بھی اُسے نفرت ہو گئی ہے۔ کہتی ہے اُسی نے میرے لال کو گھر سے نکالا۔

میرا بھولا بھالا غریب لڑکا اس شوقین عورت کے پنجے میں پھنسکر کہیں کا نہ رہا
منشی بجردھر اُس سے بار بار کہتے ہیں کہ چل کر جگدیش پور میں رہو۔ پر اس سے
وہ اپنا چھوٹا سا گھر نہیں چھوڑا جاتا۔

منشی جی کو اب ریاست سے ایک ہزار روپے ماہوار وثیقہ ملتا ہے۔ راجہ صاحب نے اُنہیں ریاست کے کاموں سے سبکدوش کر دیا ہے۔ اس لئے وہ اب زیادہ تر گھر ہی پر رہتے ہیں۔ ذوق شراب تو ثروت کے ساتھ نہیں بڑھا، بلکہ اور کم ہوگیا ہے۔ لیکن نغمہ سے دلچسپی اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ محلہ میں اب کوئی غریب نہیں رہا۔ منشی جی نے سب کو کچھ نہ کچھ ماہوار باندھ دیا ہے۔ انکے ہاتھ میں پیسہ کبھی نہیں ٹکتا۔ لیکن وہ خیرات کو خیرات سمجھ کر نہیں دیتے۔ یہ اس لئے دیتے ہیں کہ عاقبت میں ثواب ہوگا۔ وہ اس لئے دیتے ہیں کہ یہ ان کی عادت ہے۔ یہ بھی ان کا ایک شوق ہے۔ اور اس میں اُنہیں لطف آتا ہے۔ اس لئے جو کچھ دیتے ہیں چھپا کر دیتے ہیں۔ وہ اب بھی خالی ہاتھ رہتے ہیں اور دیبیوں کے سلئے سوررما کی جان کھاتے رہتے ہیں۔ گڑ بڑ کر شکایت نامہ لکھتے ہیں۔ جاکر کھوٹی کھری سُناتے ہیں اور کچھ نہ کچھ لے ہی آتے ہیں سوررما کو بھی شاید ان کی کڑوی باتیں میٹھی لگتی ہیں۔ وہ ان کی فرمائشیں پوری کرتی ہے۔ مگر چار باتیں سُنکر۔ اتنے پر بھی منشی جی کو قرض لینا پڑتا ہے۔ انکی زندگی کا سب سے مبارک موقع وہ ہوتا ہے۔ جب وہ شنگدھر کو گود میں لئے محلے بھر کے لڑکوں کو مٹھائیاں اور پیسے تقسیم کرتے ہیں۔

ایک دن شنگدھر نو بجے ہی آپہونچا۔ گردسیوک سنگھ بھی اُسکے ساتھ تھے یہ حضرت ریاست کے تسلے تھے۔ جس وقت جو کام ضروری سمجھا جاتا تھا اُسی کام پر تعینات کر دیئے جاتے تھے۔ نرملا اسوقت تلسی کو پانی چڑھا رہی تھی۔

جب وہ پوجا کر کے آئی تو ششنگدھر نے پوچھا۔ دادی جی تم پوجا کیوں کرتی ہو۔
نرملا نے ششنگدھر کو گود میں لیکر کہا۔ بیٹا! بھگوان سے مناتی ہوں کہ میری مُرادیں پوری کریں!

ششنگدھر۔ بھگوان سب کے دِل کی باتیں جانتے ہیں؟

نرملا۔ ہاں بیٹا! بھگوان سب کچھ جانتے ہیں۔

ششنگدھر۔ تو تم بھگوان سے کیوں نہیں کہتیں کہ بابوجی کو گھر لے آئیں۔

نرملا۔ بہت کہتی ہوں بیٹا پر وہ نہیں سُنتے۔

دوسرے دن ششنگدھر نے بڑے سویرے اشنان کیا۔ لیکن اشنان کر کے وہ ناشتہ کرنے نہ گیا۔ گروسیوک سنگھ کے پاس پڑھنے بھی نہ گیا۔ اہلیا ادھر اُدھر دیکھنے لگی، کہاں چلا گیا۔ منورما کے پاس آکر دیکھا۔ وہاں بھی نہ تھا۔ دونوں گھبرائیں کہ لڑکا نہا کر کہاں چلا گیا۔ چاروں طرف تلاش ہونے لگی۔ دونوں بغیچہ کی طرف دوڑی گئیں۔ وہاں پتلے سرے پر ایک گوشہ میں اس کی جھلک دکھائی دی۔ دونوں دبے پاؤں وہاں گئیں اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہو کر اُسے دیکھنے لگیں۔ ششنگدھر تلسی کے چبوترے کے سامنے آسن مارے آنکھیں بند کئے دھیان لگائے بیٹھا تھا۔ اسکے سامنے کچھ پھول پڑے تھے۔ ایک لمحہ میں اُس نے آنکھیں کھولیں۔ کئی بار چبوترے کا طواف کیا اور گھر کی طرف چلا۔ دونوں عورتیں آڑ سے نکل کر اسکے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ششنگدھر اُنہیں دیکھ کر کچھ لجا گیا۔

منورما نے پوچھا۔ یہاں کیا کرتے تھے بیٹا؟

ششنگدھر۔ کچھ تو نہیں یوں ہی گھومتا تھا۔

منورما۔ نہیں کچھ تو کر رہے تھے۔

ششنگدھر۔ جائیے آپ سے کیا مطلب۔

اہلیا۔ تمہیں نہ بنا وے گا۔ میں تو اس کی ماں ہوں۔ مجھے بتلایئے گا میرے کان میں کہدو بٹیا۔ میں کسی سے نہ کہوں گی۔

شنگدھر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ میں بھگوان سے منا تا تھا کہ بابوجی جلد آجائیں۔

بھولے بچے کی یہ سر زندانہ سعادت مندی دیکھ کر دونوں دیو ہاں رونے لگیں۔

(۳۷)

ادھر کچھ دنوں سے لونگی تیرتھ کرنے چلی گئی تھی۔ گر دسیوک سنگھ اس مذہبی عقیدت کے باعث تھے۔ اس بارئرلے کے ثواب میں وہ بھی شریک ہوگئے یا نہیں اس کا فیصلہ تو مشکل ہے۔ پر ان کے والد کو حصہ ملنا یقینی تھا۔ جب سے وہ گئی تھی دیوان صاحب دیوانے ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ گر دسیوک سنگھ کو بھی کبھی کبھی تسلیم کرنا پڑتا۔ کہ دیوان صاحب کی نگہداشت کے لئے لونگی کا گھر میں رہنا ضروری ہے۔ اُن کا ذوق مے نوشی روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ کھانا وہ بہت ہی کم کھاتے تھے۔ لونگی ان کی خورش کا معقول انتظام کرتی رہتی تھی۔ فرائض زوجیت کا وہ زریں اصول جو چالیس کی عمر کے بعد شوہر کی شکم پروری کا حامی ہے ہمیشہ اسکے پیش نظر رہتا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی۔ گھوڑے اور مرد کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ صرف انہیں راتب ملنا چاہیئے۔ ٹھاکر صاحب کو اب لونگی کے نام سے بھی نفرت ہے۔ اُسے خطوں میں لکھا کرتے ہیں۔ تم نے میری زندگی خراب کردی۔ میری دُنیا اور آخرت دونوں ہی گذار دی۔ شاید لونگی کو جلانے ہی کے لئے ٹھاکر صاحب سبھی کام لونگی کی مرضی کے خلاف کرتے تھے اور اُسے اس کی اطلاع بھی دے دیتے تھے۔ آخر ش یہ بھی لکھ دیتے تھے کہ اب تمہارے

یہاں آنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے ۔میری بہو تم سے کہیں اچھی میری خدمت کرتی ہے ۔ ہر ایک خط میں وہ اپنی صحت کا چرچہ ضرور کرتے تھے ۔ ان کا ہاضمہ اب بہت صحیح ہو گیا تھا ۔ خون کے بڑھ جانے سے جتنے امراض پیدا ہو جاتے ہیں ان کا اب کوئی اندیشہ نہ تھا ۔

دیوان صاحب کا ہاضمہ صحیح ہو گیا ہو پر عقل ضرور کمزور ہو گئی تھی ۔ وہ اب ایسی ایسی غلطیاں کرتے تھے کہ راجہ صاحب کو ان کا بہت لحاظ کرنے پر بھی بار بار تنبیہ کرنی پڑتی تھی ۔ وہ مستعدی ، وہ دانائی ، وہ معاملہ فہمی جس نے انہیں چپڑاسی سے دیوان بنایا تھا ۔ اب ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھی ۔ گرو سیوک سنگھ کو بھی شاید اب معلوم ہونے لگا ہے کہ والد کی آڑ میں کوئی دوسری ہی طاقت ریاست کا انتظام کرتی تھی ۔

ایک دن انہوں نے دیوان صاحب سے پوچھا ۔ لونگی کب تک آویں گی ۔

دیوان صاحب نے بے اعتنائی سے جواب دیا ۔ اُسکے یہاں آنے کی تو کوئی خاص ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔

اُسی دن بھائی بہن میں بھی اِس معاملے پر گفتگو ہوئی ۔ منورما نے کہا ۔ بھیا کیا تم نے لونگی اماں کو بلا نہیں لیا ۔ بابو جی کی حالت دیکھ رہے ہو کہ نہیں ۔

گرو سیوک ۔ کھانا تو کھاتے نہیں ۔ کوئی کیا کرے ۔ جب دیکھو شراب ۔ جب دیکھو شراب ۔

منورما ۔ اِس کی روک تھام لونگی ہی کر سکتی ہے ۔ اِس کو بلانا ہوگا اور بہت جلد ۔

گرو سیوک ۔ تو میرا کیا اختیار ہے ۔ بار بار کہتا ہوں بلا لیجئے ۔ مگر سنتے ہی نہیں اُلٹے اُسے چڑھانے کو اور لکھ دیتے ہیں ۔ یہاں تمہارے آنے کی ضرورت نہیں

وہ ایک ضدن ہے۔ اس طرح کیوں آنے لگی۔

منورما۔ نہیں بھیا وہ لاکھ ضدن ہو۔ لیکن دادا پر جان دیتی ہے۔ وہ صرف تمہارے خوف سے نہیں آرہی ہے۔ تیرتھ یاترا پر اس کا اعتقاد کبھی نہ تھا۔ وہاں رو رو کر اُسکے دن کٹ رہے ہونگے۔

گروسیوک۔ نورا میں سچ کہتا ہوں۔ میں دل سے چاہتا ہوں، وہ آجائے مگر سوچتا ہوں جب دادا جی منع کرتے ہیں، تو میرے بلانے سے کیوں آنے لگی۔

منورما۔ تم سمجھتے ہو، دادا جی اُسے منع کرتے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر بھی ایسا کہتے ہو۔ جب سے اماں جی کا انتقال ہوا، لونگی نے دادا پر حکومت کی ہے۔ میں نے کسی بیاہتا عورت میں یہ شوہر پروری نہیں دیکھی۔ اگر دادا کو زندہ رکھنا چاہتے ہو تو جا کر لونگی اماں کو اپنے ساتھ لاؤ۔

گروسیوک۔ میرا جانا تو بہت مشکل ہے نورا۔

منورما۔ کیوں، کیا اس میں آپکی توہین ہوگی؟

گروسیوک۔ وہ سمجھے گی۔ آخر انہیں کو غرض پڑی۔ آکر اور سر چڑھ جائگی۔

منورما۔ بھیا ایسی اوچھی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ لونگی دیوی ہے۔ تمہاری یہ بدگمانی دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔

گروسیوک۔ میں اب اُس سے کبھی نہ بولوں گا۔ اسکے کسی بات میں بھول کر بھی دخل نہ دوں گا۔ لیکن اُسے بلانے نہ جاؤں گا۔

منورما۔ اچھی بات ہے۔ تم نہ جاؤ۔ لیکن میرے جانے میں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے؟

گروسیوک۔ تم جاؤگی؟

منورما۔ کیوں میں کیا ہوں۔ کیا میں بھول گئی ہوں کہ لونگی اماں ہی نے مجھے

اپنا دودھ پلاکر پالا ہے۔ اگر وہ اِس گھر میں آکر رہتی۔ تو میں اپنے ہاتھوں سے اس کے پیر دھوتی۔ اور چرنامِرت آنکھوں سے لگاتی۔

گروسیوک شرمندہ ہو گئے۔ گھر جاکر اُنہوں نے دیکھا کہ دیوان صاحب لحاف اوڑھے پڑے ہوئے ہیں۔ پوچھا، آپکی کیسی طبیعت ہے؟

دیوان صاحب کی لال آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ بولے کچھ نہیں جی۔ ذرا سردی لگ رہی تھی۔

گروسیوک۔ آپکی منشا ہو تو میں جاکر لونگی کو بلا لاؤں۔

ہری سیوک۔ تم! نہیں تم اُسے بلانے کیا جاؤ گے۔ کوئی ضرورت نہیں۔ ایسی کہاں کی امیرزادی ہے۔

گروسیوک۔ نورا آج بہت ناراض ہو رہی تھی۔ وہ خود اُسے بلانے جا رہی ہے۔

ہری سیوک آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔ نورا جانے کو کہتی ہے؟ نہیں میں اُسے نہ جانے دوں گا۔ لونگی کو بلانے نورا نہیں جا سکتی۔

گروسیوک کیا جانتے تھے، اِن الفاظ میں کیا معنی چھپے ہوئے ہیں وہاں سے چلے گئے۔

دوسرے دن دیوان صاحب کو بخار ہو آیا۔ بخار اتنی شدت کا تھا کہ گروسیوک نے گھبرا کر ڈاکٹر کو بلایا۔ منورما بھی خبر پاتے ہی دوڑی ہوئی آئی۔ اُس نے آتے ہی آتے گروسیوک سے کہا۔ میں نے آپ سے کل ہی کہا تھا۔ جاکر لونگی اماں کو بلا لائیے۔ لیکن آپ نہ گئے۔

گروسیوک۔ میں تو جانے کو تیار تھا۔ لیکن جب نورا جانے بھی نہ دے۔ دادا سے پوچھا تو وہ مجھی کو بے وقوف بنانے لگے۔

منورما۔ تمہیں ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کی حالت کیا دیکھ نہیں رہے ہو۔ اب بھی موقع ہے۔ تم اسی گاڑی سے چلے جاؤ۔ اور اُسے ساتھ لاؤ۔

دیوان صاحب منورما کو دیکھ کر بولے۔ آؤ نورا بجھے آج بخار آگیا۔ گروسیوک کہہ رہا تھا کہ تم لونگی کو بُلانے جا رہی ہو۔ بیٹی اس میں تمہاری توہین ہے۔ بھلا تم اُسے بلانے جاؤگی تو دُنیا کیا کہے گی۔

منورما۔ دُنیا جو چاہے کہے۔ میں نے بھتیا کو بھیجدیا۔

ہری سیوک۔ سچ ؟ یہ تم نے کیا کیا۔ لونگی کبھی نہ آئے گی۔

منورما۔ آئے گی کیوں نہیں۔ نہ آئے گی۔ تو میں جاکر اُسے منا لاؤنگی۔

ہری سیوک کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اُٹھا۔ بجھی ہوئی آنکھیں جگمگا اُٹھیں خوش ہوکر بولے۔ نورا تم سچ مچ رحم کی پُتلی ہو۔ دیکھو اگر لونگی آئے اور میں نہ رہوں تو اُسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اُس نے میری بڑی خدمتیں کی ہیں۔ میں کبھی اُسکے احسان کا بدلہ نہیں چُکا سکتا۔ میں چاہوں تو اپنی ساری جایداد اسکے نام لکھ سکتا ہوں۔ یہ سب جایداد میری کی پیدا کی ہوئی ہے لیکن وہ چڑیل میری جایداد کا ایک تنکا بھی نہ چھوئے گی۔ وہ صرف عزت کی بھوکی ہے کوئی اس سے عزت کے ساتھ بولے اور لُوٹ لے۔ وہ اس گھر کی مالکن بنکر بھوکوں مرجانا پسند کرے گی۔ لیکن خادمہ بن کر سونے کا لقمہ بھی نہ کھائے گی۔ گروسیوک نے آج تک اُسے نہ پہچانا۔ نورا جس دن سے وہ گئی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے جسم کی روح ہی غائب ہوگئی۔ مجھے اپنے اوپر ذرا بھی بھروسہ نہیں رہا۔ تمہیں اپنے بچپن کی یاد آتی ہے۔؟

منورما۔ بہت پہلے کی باتیں تو یاد نہیں ہیں۔ لیکن اپنے بیماری کی یاد ہے۔

ہری سیوک۔ نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ اس سے پہلے کا ذکر ہے لوراما جب گروسیوک تین سال کا تھا اور تمہاری اماں تمہیں سال بھر کی چھوڑ کر چل بسی تھیں میں پاگل ہوگیا تھا۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ خودکشی کر لوں۔ اس حالت میں اُسی لونگی نے میری جان بچائی۔ میں اُسکے حسن اور شباب پر فریفتہ نہ تھا۔ تمہاری ماں کے بعد کس کا حسن مجھے فریفتہ کر سکتا تھا۔ مجھے لونگی کی بے غرض خدمت اور جاں نثاری نے موہ لیا۔ تمہاری ماں بھی تم دونوں بھائی بہن کی پرورش اتنے دل و جان سے نہ کر سکتی۔ گروسیوک کی بیماری کی یاد تمہیں کیا آئے گی۔ خون کے دست آتے تھے اور تل تل پر۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ رہ رہ کر تو اس طرح گویا کراہ رہا ہو۔ یہ لونگی ہی تھی جسنے اُسے موت کے منہ سے نکال لیا۔ کوئی ماں اپنے بچے پر اس طرح جان نہ دیتی۔ اور آج گروسیوک اُسے گھر سے نکال رہا ہے سمجھتا ہے کہ لونگی کسی لالچ سے مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ احمق یہ نہیں سوچتا کہ جس وقت لونگی اس کی ہڈیاں لے کر رویا کرتی تھی۔ تو دولت کہاں تھی سچ پوچھو تو یہاں لکشمی بھی لونگی کے ساتھ ہی آئی۔ بلکہ لکشمی لونگی ہی کے شکل میں آئی۔ کیوں لوراما میرے سرہانے کون کھڑا ہے۔ کوئی باہری آدمی ہے۔ کہدو یہاں سے چلا جائے۔

منورما۔ یہاں تو میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ آپکی طبیعت کیسی ہے؟

ہری سیوک۔ طبیعت گھبرا رہی ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کہیں درد نہیں بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چراغ میں تیل نہیں رہا۔ گروسیوک شام تک پہونچ جائے گا۔؟

منورما۔ ہاں کچھ رات جاتے جاتے پہونچ جائینگے۔

ہری سیوک۔ کوئی تیز موٹر ہو تو میں شام تک پہونچ جاؤں۔

منورما۔ اس حالت میں اتنا لمبا سفر آپ کیسے کر سکتے ہیں۔

ہری سیوک۔ ہاں! یہ ٹھیک کہتی ہو بیٹی۔ لیکن میری دوا لونگی ہی کے پاس ہے۔ اس ستی کا کیسا اقبال تھا۔ جب تک وہ رہی ہے۔ میرے سر میں کبھی درد نہیں ہوا۔ میری حماقت دیکھو۔ کہ جب اُس نے تیرتھ جاترا کی خواہش ظاہر کی۔ تو میرے منہ سے ایک بار بھی نہ نکلا مجھے کس پر چھوڑ کر جاتی ہو۔ اگر میں یہ کہہ سکتا تو وہ کبھی نہ جاتی۔ ایک بار بھی نہیں روکا۔

یہ کہتے کہتے دیوان صاحب پھر چونک پڑے اور دروازے کی طرف پُرخوف آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔ یہ کون اندر آ گیا نورا، مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ لیٹا ہوا مزے سے باتیں کر رہا ہوں۔

منورما نے اُمنڈنے والے آنسوؤں کو نگل کر پوچھا۔ کیا آپ کا جی پھر گھبرا رہا ہے۔

ہری سیوک۔ وہ کچھ نہیں تھا نورا! میں نے اپنی زندگی میں اچھے کام بہت کم کئے اور بُرے کام بہت۔ اچھے کام جتنے کئے وہ لونگی نے کئے۔ بُرے کام جتنے کئے وہ میرے ہیں۔ ان کی سزا کا سزاوار میں ہوں۔ لونگی کے کہنے پر چلتا تو آج فرشتہ ہوتا۔ ایک بات تُم سے پوچھوں نورا بتاؤ گی۔؟ تم اپنے مقدر سے خوش ہو؟

منورما۔ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟ کیا میں نے آپ سے کبھی شکایت کی ہے؟

ہری سیوک۔ نہیں نورا۔ تم نے کبھی شکایت نہیں کی۔ اور نہ کرو گی لیکن میں نے تمہارے اوپر جو ستم کیا ہے۔ اس کا صدمہ آج میرے دل کو بے تاب کر رہا ہے۔ میں نے تمہیں اپنے حرص کا شکار بنایا۔ لونگی نے کتنی مخالفت کی۔ لیکن میں نے ایک نہ سُنی۔ ہوس نے مجھے اندھا بنا دیا تھا۔ پھر جی ڈوبا جاتا ہے

شاید اس دیوی کے درشن نہ ہونگے۔ تم اس سے کہدینا نوزا کہ یہ خودغرض کمینہ بیوقوف آدمی آخردم تک اسکی یاد میں تڑپتا رہا۔

منورما نے روکر کہا۔ دادا! آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟ لونگی اماں کل شام تک آجائینگی۔

ہری سیوک ہنسے۔ وہ بے رونق ہنسی جو ساری زندگی کی آرزوؤں اور تمناؤں کو حقیر سمجھتی ہے۔ پھر مشتبہ انداز سے بولے۔ کل شام تک؟ شاید۔

منورما آنسوؤں کے سیلاب کو روکے ہوئے تھی۔ اس کو اس بچپن کے گھر میں بھی آج ایک دہشت سی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آفتاب کی روشنی زرد ہوگئی ہے۔ گویا فطرت کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔

دیوان صاحب چھت کیطرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھے۔ گویا انکی آنکھیں اسباب کے اس پار پہونچ جانا چاہتی ہیں۔ یکایک انہوں نے کہا۔ ذرا قلم دوات لے کر میرے قریب آجاؤ نوزا۔ کوئی اور تو یہاں نہیں ہے؟ میری وصیت لکھ لو۔ گروسیوک کی لونگی سے نہ بنے گی۔ میرے بعد وہ اُسے ستائیگا میں اپنی سب جائداد لونگی کو دیئے جاتا ہوں۔ جائداد کے لالچ سے گروسیوک اس سے دبے گا۔ یہ وصیت تم اپنے ہی پاس رکھنا۔ ضرورت پڑنے پر اس سے کام لینا۔

منورما اندر جاکر رونے لگی۔ اس کی بھابی اُسے روتے دیکھ کر گھبرائی ہوئی آکر دیوان صاحب کے آگے کھڑی ہوگئی۔ کمرے میں وہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جس کی تفسیر ہوائیں لکھی ہوئی ہے۔ اس نے دیوان صاحب کے پیروں پر سر رکھدیا اور رونے لگی۔ دیوان صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بیٹی یہ میرا آخری وقت ہے۔ گروسیوک کے آنے تک کیا ہوگا نہیں

جانتا۔ میرے بعد لونگی بہت دن زندہ نہ رہے گی۔ اس کا دل نہ دُکھانا میری تم سے یہی درخواست ہے۔ جو کچھ کرنا اس کی صلاح سے کرنا۔ وہ اسی میں خوش ہوگی۔

یہ کہتے کہتے دیوان صاحب کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ کئی منٹ کے بعد وہ چونک پڑے۔ اور منتظر نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔ ابھی نہیں آئی۔ اب ملاقات نہ ہوگی۔

منورما نے روکر کہا۔ دادا جی مجھے بھی کچھ کہتے جائیے۔ میں کیا کروں۔ دیوان صاحب نے آنکھیں بند کئے ہوئے کہا۔ لونگی کو دیکھو!

تھوڑی دیر میں راجہ صاحب آ پہونچے۔ اہلیا بھی ان کے ساتھ تھی۔ منشی بجر دھر لوبھی اڑتی ہوئی خبر ملی، دوڑے آئے۔ ریاست کے صدہا ملازم جمع ہو گئے۔ مگر دیوان صاحب کی آنکھیں بند تھیں۔

شام ہوگئی تھی، سب لوگ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ در و دیوار پر موت کا رعب چھایا ہوا تھا۔ سبھی کو تعجب ہو رہا تھا۔ کہ اتنی جلد یہ کیا ہو گیا۔ ابھی کل شام تک تو بھلے چنگے تھے۔ دیوان صاحب بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ مگر آنسوؤں کی دھاریں بہ بہہ کر رخساروں کو تر کر رہی تھیں۔ اس حسرت کا کون اندازہ کر سکتا ہے

یکایک دروازے پر ایک بگی آکر رکی اور اس میں سے ایک عورت اُتر کر گھر میں داخل ہوئی۔ شور مچگیا۔ آگئی! آگئی!! یہ لونگی تھی۔ اتنے آدمیوں کو جمع دیکھ کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ اُسکے کمرے میں آتے ہی اور لوگ ہٹ گئے صرف منورما، اس کی بھابی اور اہلیا رہ گئیں۔ لونگی نے دیوان صاحب کے سر پر ہاتھ رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ پران ناتھ! کیا مجھے اکیلے چھوڑ جاؤ گے؟

دیوان صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان آنکھوں میں درد اور محبت کی ایک دُنیا چھپی ہوئی تھی۔ انہوں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ اور پہلے کیوں نہ آئیں۔

لونگی نے دونوں پھیلے ہوئے ہاتھوں کے بیچ میں اپنا سر رکھدیا اور اس بے جان قریب المرگ ہستی کے آغوش میں اُسے اس روحانی تقویت۔ اعتماد اور آسودگی کا احساس ہوا۔ جس سے ابتک وہ ناآشنا تھی۔ اس لذت درد میں وہ اپنا غم بھول گئی۔ پچیس سال کے سہاگ میں اُسے کبھی راحت نہ حاصل ہوئی تھی۔ اُسے ہمیشہ بدگمانیوں کا شکار بننا پڑتا تھا۔ ہمیشہ یہ اندیشہ ہوتا رہتا تھا کہ دیکھیں یہ ڈونگی پار لگتی ہے یا منجدھار میں ڈوب جاتی ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا موجوں کا ہلکا سا تلاطم، کشتی کی ہلکی سی لرزش، اس کی روح فنا کردیتی تھی۔ آج اُس سارے کوفت اور خلش کا خاتمہ ہوگیا۔ آج اُسے معلوم ہوا کہ جس کے قدموں پر میں نے اپنے کو نثار کیا تھا؛ جسکے ہاتھوں میں میں نے اپنی تقدیر سونپی تھی۔ وہ آخر دم تک میرا رہا۔ یہہ غمناک تسکین بھی کتنی حیات بخش اور کتنی سکون انگیز تھی۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ لاش ابھی تک کریاکرم کے انتظار میں پڑی ہوئی تھی۔ رونے والے رو دھو کر چپ ہو گئے تھے۔ لونگی اس کے سرہانے اس طرح بیٹھی ہوئی تھی۔ گویا اُسکے جاگ اُٹھنے کی منتظر ہو۔ اور منورما بیٹھی دیوان صاحب کے آخری لفظوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے کانوں میں یہ الفاظ گونج رہے تھے، لونگی کو دیکھو!

(۳۸)

جگدیش پور کے ٹھاکر دوارے میں اکثر سادھو دھاتما آتے رہتے تھے۔

شنگدھران کے پاس جا بیٹھتا۔ اور اُن کی باتیں بڑے غور سے سنتا۔ اُس کے پاس چکردھر کی جو تصویر تھی۔ اُس سے ان کی صورت کا مقابلہ کرتا پر اُس شکل کا کوئی سادھو اُسے نہ دکھائی دیتا تھا۔

ایک دن منورما کے ساتھ شنگدھر بھی لونگی کے پاس گیا۔ لونگی بڑی دیر تک اپنی تیرتھ یاترا کا سرگذشت سناتی رہی۔ شنگدھر نے اس کی باتیں غور سے سننے کے بعد پوچھا۔ کیوں دائی تمہیں سادھو سنیاسی بہت سے ملے ہونگے؟ لونگی نے کہا۔ ہاں بیٹا بہت ملے کیوں نہیں۔ ایک مہاتما تو ایسے ملے کہ تمہارے بابو جی سے ہو بہو صورت ملتی تھی۔

شنگدھر نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔ جٹا بڑی بڑی تھی۔؟

لونگی۔ نہیں۔ جٹا ڈاٹا تو نہ تھی، نہ کپڑے ہی گیروے رنگ کے تھے، ہاں کمنڈل لئے ہوئے تھے۔ جتنے دنوں میں جگن ناتھ پوری میں رہی وہ ایک بار روز میرے پاس آکر پوچھ جاتے، کیوں ماتا جی آپ کو کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہے؟ اور یاتریوں سے بھی وہ یہی سوال پوچھتے تھے۔ جس دھرم شالہ میں میں ٹھیری تھی۔ اُسی میں ایک دن ایک یاتری کو ہیضہ ہو گیا۔ سنیاسی جی اُسے اٹھوا کر اسپتال لے گئے۔ اور اس کی دوا دارو کروائی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی امیر آدمی ہے۔ جن یاتریوں کے پاس کرایہ کے روپے نہ ہوتے۔ انکی مدد کرتے تھے۔ نورا۔ تم سے کیا کہوں بابو جی سے بالکل صورت ملتی تھی میں نے نام پوچھا تو سیوا نند بتایا۔ مکان پوچھا تو مسکرا کر بولے سیوا نگر۔ ایک دن میں نے ان کی دعوت کی۔ جب وہ کھانے بیٹھے۔ تو میں نے یہاں کا ذکر چھیڑ دیا میں دیکھنا چاہتی تھی، ان باتوں سے انکے دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ مگر انہوں نے کچھ بھی نہ پوچھا۔ چپ چاپ کھا کر چلے گئے۔ اس دن سے وہاں پھر نہ دکھائی

دے دیئے۔ اوروں سے پوچھا تو معلوم ہوا رامیشور چلے گئے۔

شنکر دھر نے پوچھا۔ تم نے یہاں تار کیوں نہ دے دیا۔ ہم لوگ وہاں پہونچ جاتے۔

لونگی۔ ارے تو کوئی بات بھی ہو بیٹا۔ بغیر جانے بوجھے کیا تار دیتی۔

منورما۔ مان لو یہی ہوتے تو کیا تم سمجھتے ہو وہ تمہارے ساتھ آتے۔ کبھی نہیں۔ آنا ہوتا تو جاتے ہی کیوں۔

شنکر دھر۔ کس بات پر ناراض ہو کر چلے گئے رانی اماں؟ کوئی نہ کوئی بات تو ہوئی ہوگی۔ اماں سے پوچھتا ہوں تو رونے لگتی ہیں۔ تم سے پوچھتا ہوں تو تم بتاتی ہی نہیں۔

منورما۔ میں کسی کے دل کی بات کیا جانوں بیٹا۔ کسی سے کچھ کہا سنا تھوڑا ہی۔

شنکر دھر۔ اچھا دائی تمہارے خیال میں سنیاسی جی کی عمر کیا رہی ہوگی۔؟

لونگی۔ میں تو سمجھتی ہوں۔ انکی عمر چالیس برس کی ہوگی۔

شنکر دھر نے کچھ حساب کرکے کہا۔ یہی تو بابو جی کی بھی عمر ہوگی۔

منورما نے مصنوعی غصہ سے کہا۔ ہاں ہاں وہی سنیاسی تمہارے بابو جی ہیں۔ اب مانا۔ ابھی انکی عمر چالیس برس کیسے ہو جائے گی۔

شنکر دھر سمجھ گیا کہ منورما کو یہ ذکر برا لگتا ہے۔ اسکے متعلق پھر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ لیکن وہاں رہنا اب اسکے لئے غیر ممکن تھا۔ رامیشور کا حال تو اس نے کتابوں میں پڑھا تھا۔ لیکن اس کتابی واقفیت سے اسے اطمینان نہ ہوا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ رامیشور کو کون ریل جاتی ہے۔ وہاں

لوگ جاکر ٹھیرتے کہاں ہیں۔ گھر کے کتب خانہ میں شاید ایسی کوئی کتاب مل جائے۔ یہ سوچکر وہ باہر آیا اور شوفر سے بولا۔ مجھے گھر پہنچا دو۔ شوفر نے پہلے تو بہانہ کیا۔ لیکن جب شنگدھر نے اصرار کیا تو مجبور ہو گیا۔

گھر آکر وہ کتب خانہ میں جا ہی رہا تھا کہ گروسیوک سنگھ مل گئے۔ آجکل یہ حضرت دیوانی کی منصب کے لئے زور لگا رہے تھے۔ ہر ایک کام بڑی مستعدی سے کرتے مگر معلوم نہیں کیوں راجہ صاحب ان سے بدظن تھے۔ منورما کہہ چکی۔ اہلیا نے بھی سفارش کی مگر راجہ صاحب ابھی تک ٹالتے جاتے تھے۔ شنگدھر انہیں دیکھتے ہی بولا۔ ماسٹر صاحب! مہربانی کر کے مجھے کتب خانہ سے کوئی ایسی کتاب نکال دیجئے۔ جسمیں تیرتھ استھانوں کا پورا پورا حال ہو۔

گروسیوک نے کہا۔ ایسی تو کوئی کتاب کتب خانہ میں نہیں ہے۔

شنگدھر وہیں سے لوٹ پڑا اور ایک موٹر تیار کر کے شہر جا پہونچا۔ ابھی اس کا تیرھواں ہی سال تھا۔ لیکن اسکے اطوار میں اتنا استحکام تھا کہ جو بات دل میں ٹھان لیتا اُسے پورا کر کے ہی چھوڑتا۔ شہر جاکر اُس نے انگریزی کتابوں کی کئی دوکانوں میں کئی کتابیں خریدیں۔ اور گھر چلا تو کتابوں کا ایک گٹھڑ اسکے ساتھ تھا؛

راجہ صاحب کھانے پر بیٹھے تو شنگدھر وہاں نہ تھا۔ اہلیا نے جاکر دیکھا تو وہ کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ بولی چل کر کھانا کھالو۔ داداجی بلا رہے ہیں۔

شنگدھر نے بھوک کا بہانا کیا۔ اہلیا سمجھ گئی کسی کتاب میں اس کا جی لگا ہوا ہے۔ آکر اسکے سامنے کھلی ہوئی کتاب اٹھالی اور دو چار سطریں پڑھکر بولی اسمیں تو تیرتھوں کا حال لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب کہاں سے لائے؟

ششنکھدھر نے کہا۔ آج ہی تو بازار سے لایا ہوں۔ دائی کہتی تھیں کہ بابوجی کیصورت کا کوئی سنیاسی انہیں جگن ناتھ پوری میں ملا تھا۔ اور وہاں سے رامیشور چلا گیا۔

لڑکے کی یہ فرزندانہ محبت دیکھکر اہلیا کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ آہ میرے لال! تو نے باپ کی صورت بھی تو نہیں دیکھی۔ تجھے تو اتنا بھی یاد نہیں کہ کب ان کی گود میں بیٹھا تھا کب انکے منہ سے پیار کی باتیں سُنی تھیں۔ پھر بھی تجھے ان سے اتنی محبت ہے؟ اور وہ اتنے سنگدل ہیں کہ سُدھ ہی نہیں لیتے۔ اگر مجھ سے ناراض ہیں تو تُو نے کونسی خطا کی ہے۔ کیا میرے کارن تو بھی اُن کی نظروں سے گر گیا۔ پران ناتھ! انہیں کیا معلوم کہ جس بیٹے کیطرف سے تم نے دل پتھر کر لیا ہے۔ وہ تمہارے نام کی مالا پھیر رہا ہے۔ تمہاری مورتی کی پُوجا کرتا ہے۔

اہلیا نے ششنکھدھر کو سینے سے لگا لیا۔ اور آنسوؤں کی یورش کو روکتی ہوئی بولی۔ یہ کتاب پھر دیکھنا۔ اس وقت چل کر کچھ کھا لو۔

ششنکھدھر۔ اچھا کھا لوں گا اماں کسی سے بھجوا دو۔ تم کیوں آؤ گی۔

اہلیا ایک لمحہ میں ایک چھوٹی سی تھالی میں اس کا کھانا لے کر آئی۔ اور ششنکھدھر کے سامنے بیٹھ گئی۔

ششنکھدھر کو بھوک تو تھی۔ پر آج جب اُسے معلوم ہو گیا۔ کہ چکردھر سنیاسی ہو گئے ہیں تو یہ پُرتکلف کھانا کیسے کھاتا۔ اب تک اُسے تحقیق طور پر ان کا حال نہ معلوم تھا۔ وہ سمجھتا تھا کسی دوسری جگہ آرام سے ہونگے۔ آج لونگی کی باتوں نے اس کے دل میں ایک تشویش پیدا کر دی تھی۔ ایسی حالت میں یہاں کے عیش و آرام کا لطف اٹھانا وہ فرزندانہ سعادتمندی کے خلاف

سمجھنے لگا۔ اس لئے اس نے اہلیا سے کہا تھا کہ کھانا کسی کے ہاتھ بھجوا دینا۔ تم نہ آنا۔ اب یہ تھالی دیکھ کر وہ مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ اگر نہیں کھاتا تو اہلیا کو رنج ہوتا ہے کھاتا ہے تو لقمہ منہ میں نہیں جاتا۔ اُسے خیال آیا۔ میں یہاں چاندی کے تھال میں انواع و اقسام کی نعمتیں کھانے بیٹھا ہوں اور بابو جی پر اس وقت نہ جانے کیا گذر رہی ہوگی۔ بیچارے کسی درخت کے نیچے پڑے ہوں گے۔ نہ جانے آج کچھ کھایا بھی یا نہیں۔ وہ تھالی پر بیٹھا لیکن لقمہ اٹھاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اہلیا اس کے دل کی کیفیت سمجھ گئی۔ اور خود بھی رونے لگی۔ کون کسے سمجھاتا۔

آج سے اہلیا کو ہمیشہ یہی اندیشہ رہنے لگا۔ کہ شنکھدھر کہیں باپ کی تلاش میں بھاگ نہ جائے۔ وہ اُسے تنہا گھر سے نہ جانے دیتی۔ اُسکا بازار آنا جانا بھی بند کر دیا۔ گھر کے سبھی آدمیوں سے تاکید کر دی کہ شنکھدھر کے سامنے اسکے باپ کا ذکر نہ کریں۔ یہ خوف کسی ہیبت ناک جانور کی طرح ہمیشہ اسکے سامنے گھورا کرتا۔ کہ کہیں شنکھدھر کو باپ کے ترک وطن کا حقیقی سبب معلوم ہو جائے۔ نہیں تو پھر اُسے کون روکے گا۔

اُسے اب ہر دم یہی پچھتاوا ہوتا رہتا کہ وہ شنکھدھر کو کیوں نہ شوہر کے ساتھ لے کر چلی گئی۔ ثروت کی ہوس میں شوہر کو پہلے ہی کھو بیٹھی تھی۔ کہیں بیٹے کو بھی نہ کھو بیٹھے ؛

(۳۹)

ٹھاکر ہری سنگھ کے آخری مراسم سے فرصت پانے کے بعد ایک دن لونگی نے اپنے کپڑے لتے باندھنے شروع کئے۔ اس کے پاس روپے پیسے جو کچھ تھے سب گرو سیوک کو سونپ کر بولی۔ بھیا! میں اب کسی گاؤں میں جا کر رہونگی۔

یہاں مجھ سے نہیں رہا جاتا ؛

فی الواقع لونگی سے اب اس گھر میں نہ رہا جاتا تھا۔ گھر کی ایک ایک چیز اُسے کاٹنے دوڑتی تھی۔ پچیس برس تک اس راج کی رانی رہنے کے بعد اب وہ کسی کی دستِ نظر نہ بن سکتی تھی۔ سب کچھ اُسی کے ہاتھوں کا کیا ہوا تھا۔ مگر اب اس کا نہ تھا۔ بیوگی کے رنج کے ساتھ یہ خیال کہ میں کسی دوسرے کے روٹیوں پر پڑی ہوئی ہوں۔ اس کی قوتِ برداشت سے باہر تھا۔ حالانکہ گروسیوک اب پہلے سے کہیں زیادہ اس کا لحاظ کرتے تھے۔ اور کوئی ایسی بات نہ ہونے دیتے تھے۔ جس سے اُسے رنج ہو۔ پھر بھی کبھی ایسی باتیں ہو ہی جاتی تھیں۔ جو اس کی بیکسی کی یاد دلا دیتی تھیں۔ کوئی نوکر اب اس سے اپنی تنخواہ مانگنے نہ آتا تھا۔ ریاست کے عہدے دار اب اس کی خوشامد کرنے نہ آتے تھے۔ گروسیوک اور ان کی بیوی کے برتاؤ میں تو کوئی امتیاز نہ تھا۔ لونگی کو ان لوگوں سے جیسی اُمید تھی۔ اس سے کہیں اچھی طرح وہ پیش آتے تھے۔ لیکن دہریاں اب کھڑی جس کا منہ تاکتی ہیں وہ کوئی اور ہے۔ نوکر چاکر جس کا حکم سُننے کر دوڑے آتے ہیں۔ وہ بھی اور ہی کوئی ہے۔ دیہات کے اسامی نذرانے یا لگان کے روپے اب اسکے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ شہر کے دکانوں کے کرایہ دار بھی اب اُسے کرایہ نہیں دینے آتے۔ گروسیوک نے اپنے مُنہ سے کسی سے کچھ نہیں کہا ہے۔ زمانہ نے سارا انتظام آپ ہی آپ اُلٹ پلٹ دیا ہے مگر یہی باتیں ہیں جن سے اُس کے دل پر درد کو ٹھیس لگتی ہے۔ اور اسکی شیریں یادگاروں میں ایک لمحہ کے لئے تلخی آجاتی ہے۔ اس لئے اب وہ یہاں سے جاکر اُسی دیہات میں رہنا چاہتی ہے۔ آخر جب ٹھاکر صاحب نے اس کے نام کچھ نہیں لکھا، اُسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیا۔

تو وہ یہاں کیوں دوسروں کی دست نگر ہوکر پڑی رہے۔ اُسے اب ایک ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے اور ایک ٹکڑے روٹی کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے اس کے لئے وہ محنت کر سکتی ہے۔ جہاں رہے گی۔ وہیں اپنے گذر بھر کو کما لیگی وہ اپنی جھونپڑی میں پڑی رہتی تو آج کیوں اس کی بے عزتی اور بے قدری ہوتی۔ جھونپڑی چھوڑ کر محل میں سُکھ بھوگنے کی یہی سزا ہے :۔

گروسیوک نے کہا۔ آخر سُنیں تو، کہاں جانے کا ارادہ کر رہی ہو۔

لونگی۔ جہاں بھگوان لے جائینگے۔ وہاں چلی جاؤں گی۔ کوئی میکا یا سسرال ہے۔ جسکا نام بتا دوں۔

گروسیوک۔ مگر یہ بھی سوچتی ہو۔ تمہارے چلی جانے سے ہماری کتنی بدنامی ہوگی۔ ؟ دُنیا یہی کہے گی۔ کہ ان سے ایک بیوہ کی پرورش نہ ہوسکی، نکال باہر کیا۔ میرے لئے کہیں مُنہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی۔ تمہیں اس گھر میں جو شکایت ہو مجھ سے کہو۔ اگر میری طرف سے اسکے دُور کرنے میں ذرا بھی غفلت ہو تو پھر تمہیں اختیار ہے جو چاہنا کرنا۔

لونگی۔ کیا باندھ کر رکھوگے ؟

گروسیوک۔ ہاں باندھ کر رکھوں گا۔

اگر عُمر بھر میں لونگی کو گروسیوک کی کوئی بات پسند آئی تو انکی یہ بے جا ضد تھی۔ لونگی کا دِل مسرت سے کھل گیا۔ اس نے ذرا تیز ہوکر کہا۔ باندھ کر کیوں رکھوگے ؟ کیا تمہاری زرخرید ہوں ؟

گروسیوک۔ ہاں زرخرید ہو۔ میں نے نہیں خریدا ہے۔ تو میرے باپ نے تو خریدا ہے۔ زرخرید نہ ہوتیں تو تم بتیس سال یہاں رہتیں کیسے۔ کوئی اور آکر کیوں نہ رہگئی۔ داداجی چاہتے تو ایک درجن شادیاں کر سکتے تھے۔ اُنہوں نے

یہ کیوں نہیں کیا۔ جس وقت اماں کا انتقال ہوا۔ اس وقت اُنکی جوانی کی عمر تھی گمران کا کٹر سے کٹر دشمن بھی یہ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ کہ انہوں نے کجروی اختیار کی۔ یہ تمہارے ہی محبت کی زنجیر تھی۔ جس نے اُنہیں باندھ رکھا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں اگر تم نے گھر سے باہر قدم نکالا تو چاہے دُنیا مجھے بدنام ہی کیوں نہ کرے میں تمہارے پانوں توڑ کر رکھدوں گا۔ تمہارے نام کے ساتھ میری اور میرے باپ کی عزت بندھی ہوئی رہے۔

لونگی کے جی میں آیا کہ گروسیوک کے قدموں پر سر رکھ کر روؤں اور سینے سے لگا کر کہوں بیٹا! میں نے تو تجھے گود میں کھلایا ہے۔ تجھے چھوڑ کر میں بھلا کہیں جا سکتی ہوں۔ لیکن اُس نے مصنوعی غصے کے ساتھ کہا۔ یہ تو اچھی دل لگی ہوئی۔ یہ تو مجھے باندھ کر رکھیں گے۔

گروسیوک تو جھلاتے ہوئے باہر چلے گئے اور لونگی اپنے کمرے میں جاکر خوب روئی۔ کیا گروسیوک کسی طرح سے کہہ سکتے تھے۔ ہم تمہیں باندھ کر رکھیں گے ؟ کبھی نہیں۔

آج کئی مہینے کے بعد لونگی نے مہری سے سر میں تیل ڈالنے کو کہا۔ ادھر اُسے کسی نوکر سے کچھ کہتے ہوئے حجاب ہوتا تھا کہ کہیں یہ ٹال نہ جائے۔ نوکروں کو اس سے اب بھی وہی عقیدت تھی۔ لونگی نے خود ان سے کام لینا چھوڑ دیا تھا آج کے جھگڑے کی بھنک بھی نوکروں کے کانوں میں پڑ گئی تھی۔ انہوں نے قیاس کیا تھا کہ گروسیوک نے لونگی کو کسی بات پر ڈانٹا ہے۔ اسلئے فطرتاً ان کی ہمدردی لونگی کے ساتھ ہو گئی تھی۔ وہ آپس میں اس معاملے پر من مانی رائے زنی کر رہے تھے۔ مہری اس کا حکم سُنتے ہی تیل لاکر اس کا سر دبانے لگی۔ اور اس کی دلجوئی کرنے کے لئے بولی۔ آج چھوٹے بابو جی کس بات پر بگڑ رہے

تھے ملکن؟ کمرے کے باہر سُنائی دے رہا تھا۔ تم یہاں سے چلی گئیں تو ایک نوکر بھی نہ رہے گا۔

لونگی نے یکسانہ انداز سے کہا۔ نصیب ہی کھوٹا ہے نہیں تو کیوں کسی کی جھڑکیاں سُننی پڑتیں؟

مہری۔ نہیں ملکن نصیبے کو کھوٹا نہ کہو۔ نصیبا تو جیسا تمہارا ہے۔ ویسا کسی کا کیا ہوگا ٹھاکر صاحب مرتے دم تک تمہارا ہی نام رٹا کئے۔ کسی کی مجال ہے کہ نہیں کچھ کہہ سکے۔ یہ ساری ملکیت تمہاری پیدا کی ہوئی ہے۔ اسے کون چھین سکتا ہے۔

دفعتاً منورما نے کمرے میں قدم رکھا۔ اور لونگی کو سر میں تیل ڈلواتے دیکھ کر بولی کیسی طبیعت ہے اماں۔ کیا سر میں درد ہے۔؟

لونگی۔ نہیں بیٹی جی تو اچھا ہے۔ آؤ بیٹھو۔

منورما نے مہری سے کہا۔ تم جاؤ۔ تیل میں ڈالے دیتی ہوں۔ دروازے پر کھڑی ہو کر سُننا نہیں۔ دور چلی جانا۔

مہری اس وقت یہاں کی باتیں سُننے کے لئے اپنا سب کچھ نثار کر سکتی تھی۔ یہ حکم سُنکر منورما کو کوستی ہوئی چلی گئی۔

منورما سر دبانے بیٹھی تو لونگی نے ہاتھ پکڑ لیا اور اُس سے بولی۔ نہیں بیٹا تم رہنے دو۔ درد نہیں ہے۔ نہیں میں نہ مانونگی۔ مجھے کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا کوئی دیکھے تو کہے، بڑھیا پاگل ہو گئی ہے۔ رانی سے سر دبواتی ہے۔

منورما نے سر دباتے ہوئے کہا۔ رانی جہاں ہوں وہاں ہوں۔ یہاں تو تمہارے گود کی کھلائی ہوئی لونڈا ہوں۔ آج بھیا یہاں سے جاکر تمہارے اوپر بہت بگڑ رہے تھے۔ اُس کی ٹانگ توڑ دوں گا۔ گردن کاٹ لوں گا۔ کتنا پوچھا کچھ بتاؤ تو بات کیا ہے۔ مگر غصّے میں کچھ سُنا ہی نہیں۔ مجھ سے انکی یہ دیا دتیاں نہیں دیکھی

جانتی سمجھتے ہونگے کہ اِس گھر کا مالک میں ہوں۔ داداجی سب کچھ میرے نام چھوڑ گئے ہیں۔ مگر دادا ان کی نیت کو پہلے ہی تاڑ گئے تھے۔ میں نے آجتک تم سے نہیں کہا داماں جی! کچھ تو موقع نہ ملا۔ اور کچھ بھتیا کا لحاظ تھا۔ مگر آج اُنکی بدزبانیاں سُنکر کہتی ہوں کہ وہ اپنی ساری جایداد تمہارے نام لکھ گئے ہیں۔

لونگی پر اِس مژدہ کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اس کے چہرے پر خوشی یا غرور کا نشان تک نہ تھا۔

منورما نے پھر کہا۔ میرے پاس ان کی لکھی ہوئی وصیت رکھی ہوئی ہے۔ اور میں ہی اسکی گواہ ہوں۔ جب یہ حضرت وصیت دیکھیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔

لونگی نے ذمہ دارانہ لہجہ میں کہا۔ بیٹی تم یہ وصیت نامہ لیجا کر اُنہیں کو دیدو۔ تمہارے دادا نے ناحق یہ وصیت لکھی ہے۔ میں انکے جایداد کی بھُوکی نہیں تھی۔ ان کے پریم کی بھُوکی تھی۔ اور ایشور کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ میری جیسی تقدیر بہت کم عورتوں کو نصیب ہوتی ہے۔ میں انکے پریم کی دولت پاکر ہی خوش ہوں۔ گروسیوک کو میں نے گود میں کھلایا ہے۔ پالا پوسا ہے۔ وہ میرے مالک کا بیٹا ہے۔ انکے سامنے کی تھالی میں نہیں کھینچ سکتی۔ یہ کاغذ پھاڑ کر پھینک دو گروسیوک اگر اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ تو میری بے قدری نہ کرے گا۔ وہ مجھے ماننے نہ ماننے میں اُسے اپنا ہی سمجھتی ہوں۔ تم سر ملنے بیٹھی میرا سر دبا رہی ہو۔ دولت سے کبھی اتنا سکھ مل سکتا ہے۔ گروسیوک کے مُنہ سے "اماں" سُنکر مجھے وہ خوشی ہوگی جو سنسار کی رانی بن کر نہیں ہو سکتی۔

یہ کہتے کہتے لونگی کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں۔ منورما اس کی طرف عقیدت، غرور، تعجب اور احترام کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ گویا کوئی دیوی ہے۔

(۴۰)

رانی بسومتی تو بہت دنوں سے پوجا پاٹ میں مصروف رہتی تھیں۔ بہت تھوڑا کھاتیں اور وہ بھی صرف ایک بار۔ آرائش اور نفاست سے بھی اُنہیں اب نفرت ہوگئی تھی۔ رانی رام پریا کیحالت سابق دستور تھی۔ سب سے الگ اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھی ہوئی گانے بجانے کی مشق کیا کرتی۔ پورلنے سِکّے۔ دیگر ممالک کے ٹکٹ اور اسیطرح نایاب چیزیں جمع کرنے کی اُنہیں دُھن تھی۔ اُنکا کمرہ چھوٹا سا ایک عجائب خانہ تھا۔ انہوں نے شروع ہی سے اپنے کو دنیا کے جھمیلوں سے آزاد رکھا تھا۔ اِدھر کچھ دنوں سے رانی روہنی کا دل بھی بھگتی کی جانب مائل تھا۔ وہی عورت جو پہلے حسد کی آگ میں جلا کرتی تھی۔ اب رحم اور عفو کی دیوی بن گئی تھی۔ اہلیا سے وہ بہت مانوس ہو گئی تھی۔ شنکھدھر بھی اُس سے بہت ہل گیا تھا۔ راجہ صاحب تو اس کے غلام تھے جو شنکھدھر کو پیار کرے۔ روہنی نے شنکھدھر کو گود میں کھلا کھلا کر کے اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کر لیا۔ لیکن منورما ابھی تک روہنی سے چونکتی رہتی تھی۔ مگر شنکھدھر کا روہنی کے پاس آنا جانا اُسے اچھا نہ لگتا تھا۔

جس دن منورما دیوان صاحب کا وصیت نامہ لے کر لونگی کے پاس گئی تھی۔ اُسی دن کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ راجہ صاحب پائیں باغ میں حوض کے کنارے بیٹھے مچھلیوں کو آٹے کی گولیاں کھلا رہے تھے۔ یکایک پاؤں کی آہٹ پا کر سر اٹھایا تو دیکھا روہنی آکر کھڑی ہوگئی ہے۔ آج اُسے دیکھ کر راجہ صاحب کو رقت آگئی۔ وہ یاس اور غم کی زندہ تصویر سی نظر آتی تھی۔ گویا فریاد کر رہی ہو کہ تم نے مجھے کیوں یہ سزا دے رکھی ہے"

راجہ صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا۔ کیسے چلیں روہنی۔ آؤ یہاں بیٹھو۔

روہنی نے دردناک لہجہ میں کہا۔ آپ کو یہاں بیٹھے دیکھا چلی آئی۔ میرا آنا ناگوار گذرتا ہو تو چلی جاؤں۔

راجہ صاحب نے ہمدردی کے ساتھ کہا۔ کیوں شرمندہ کرتی ہو روہنی میں تو خود ہی نادم ہوں۔ میں نے تمہارے اوپر بڑا ستم کیا ہے۔ اور نہیں جانتا مجھے اُس سے کیا سزا ملے گی۔

روہنی نے خشک ہنسی کے ساتھ کہا۔ آپ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ آپ نے وہی کیا جو اور سبھی مرد کرتے ہیں۔ اور لوگ چھپے چھپے کرتے ہیں۔ آپ نے علانیہ کیا۔ عورت کبھی مرد کا کھلونا ہے، کبھی اسکے پاؤں کی جوتی انہیں دو حالتوں میں اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ آپکی خطا نہیں۔ ہم عورتوں کو ایشور نے اس لئے بنایا ہے۔ ہمیں سب کچھ بے عذر جھیلنا چاہئے۔ شکوہ و فریاد کی اجازت نہیں۔ اور اپنی بیکسی کا اظہار کرنا تو زندگی کو برباد کرنا ہے۔

یہ طنز نہ تھا۔ روہنی کے حالات کی سچی بے لاگ تنقید تھی۔ راجہ صاحب سر جھکائے سنتے رہے۔

روہنی پھر بولی۔ آج سولہ برس ہوئے جب میں ایک بار ناراض ہو کر گھر سے نکلی تھی۔ بابو چکردھر کے اصرار سے لوٹ آئی تھی۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے۔ کبھی آپ نے بھول کر بھی پوچھا کہ تو مرتی ہے یا جیتی۔ اس سے تو یہ کہیں بہتر ہوتا کہ آپ نے مجھے چلے جانے دیا ہوتا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں میں رسوائی کے راستے پر جاتی؟ گنگا کی گود کے سوا میرے لئے اور کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ لیکن امید! ہائے امید!! اس کا بُرا ہو۔ یہی مجھے واپس لائی۔ چکردھر کا تو صرف بہانہ تھا۔ یہی نگوڑی امید تھی جو مجھے لوٹا لائی اور اسی نے مجھے سبز باغ دکھا

دکھا کر ایک زمانہ گذار دیا۔ لیکن آپ کو کبھی مجھ پر درد نہ آیا۔ آپ کو کچھ خبر ہے، یہ زمانہ میں نے کس طرح کاٹا۔ کسی کو گانے بجانے میں مزا آتا ہے۔ مجھے نہیں آتا کسی کو پوجا پاٹ میں راحت ملتی ہے، مجھے نہیں ملتی۔ میں مایوسی کی اس حد تک نہیں پہونچی۔ میں شوہر کے ہتے لٹے ہوئے سہاگ کا روپ نہیں بھر سکتی انسان کا دل تو ایک معمہ ہے۔ وہی اذیتیں جو ایک بال برداشت سہتی ہے اور سینے میں اپنی عزت سمجھتی ہے۔ وہی اذیتیں نظروں سے گری ہوئی عورت کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ میں راجپوت کی بیٹی ہوں۔ مرنا جانتی ہوں میں نے کتنی بار خودکشی کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ آپ نہ جانیں گے۔ لیکن یہی سوچکر رک گئی کہ میرے مرنے سے تو آپ اور خوش ہوں گے۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ آپ میری لاش پر آکر آنسو کی چار بوندیں گرا دینگے۔ تو شاید اب تک میں رخصت ہوگئی ہوتی۔ میں اتنی پاک نفس نہیں ہوں۔ لیکن اپنے سیتاؤں کی بے حرمتی اور بے عزتی نے مجھے ڈھارس دیا ہے۔ نہیں تو اب تک میں نہ جانے کیا کر بیٹھتی۔ سوز پنہاں عورت سے جو کچھ کرا سکتا ہے۔ اس کا آپ گمان نہیں کرسکتے اگر سیتا بھی اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھتیں۔ جو آج میں سولہ برسوں سے دیکھ رہی ہوں تو آج سیتا نہ رہتیں۔ سیتا بنانے کیلئے رام جیسا پرش چاہئے۔

راجہ صاحب نے پوچھا، کیا ساری ذمہ داری میرے ہی سر ہے۔

روہنی۔ نہیں۔ آپ کی کوئی خطا نہیں۔ وہ عورت سچ مچ بدنصیب ہے۔ جو اپنے شوہر کی برائی سوچے۔ مجھے آپ کی برائی سوچتے ہوئے سولہ سال ہوگئے میری دلی تمنا یہی رہی کہ آپ کو کوئی صدمہ ہو اور میں دیکھوں۔ لیکن اسلئے نہیں کہ آپ کو مصیبت میں دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی۔ نہیں، ابھی میرا اتنا اخلاقی زوال نہیں ہوا ہے۔ میں آپ کی برائی صرف اس لئے چاہتی تھی کہ آپ کی آنکھیں

کھُلیں۔ آپ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ شاید تب آپ کو میری یاد آتی۔ شاید تب مجھے اپنی کھوئی ہوئی جگہ پانے کا موقع ملتا۔ تب میں ثابت کر دیتی۔ کہ آپ مجھے جتنی کمینہ سمجھ رہے ہیں۔ اتنی کمینہ نہیں ہوں۔ بس آپ کو اپنی خدمت سے شرمندہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ موقع بھی نہ ملا۔

راجہ صاحب کو کسی عورت کی جذبات کی تہ تک پہونچنے کا ایسا موقع کبھی نہ ملا تھا۔ اُنہیں یقین تھا کہ اگر میں مر بھی جاؤں تو روہنی کے آنکھوں میں آنسو نہ آئیں گے۔ وہ اپنے دل سے اسکے دل کو تولتے تھے۔ وہ اگر مر جاتی تو لاریب اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔ پر آج روہنی کے دل گداز اور حسرت سے بھری ہوئی باتیں سُنکر وہ پتھر بھی موم ہو گیا۔ ہائے! اس انتقام میں بھی کتنا ایثار ہے۔

اہلیا کو آتے دیکھ کر روہنی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ذرا دیر وہاں کھڑی رہ کر دوسری اور چلی گئی۔ راجہ صاحب کے دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھ گیا۔ اُنہیں اپنی بے دردی پر افسوس ہو رہا تھا۔ آج اُنہیں معلوم ہوا کہ روہنی کا مزاج سمجھنے میں اُن سے کیسی سخت غلطی ہوئی۔ جی یہی چاہتا تھا کہ چل کر روہنی سے اپنی خطا معاف کراؤں۔ یہی باتیں اگر اس نے اور پہلے کہی ہوتیں تو دونوں کے دلوں میں کیوں یہ کدورت پیدا ہوتی۔ اگر وہ اُن سے ایک بار بھی ہنسکر ہمکلام ہوئی ہوتی۔ ایک بار بھی ان کا ہاتھ پکڑ کر کہتی۔ میں تمہیں نہ چھوڑوں گی۔ تو وہ اس سے بے اعتنائی نہ کر سکتے۔ لیکن دل نے پھر کہا۔ خودداری عورت کا ایک خاص وصف ہے۔ وہ انکی خوشامد کیوں کرتی۔ انہوں نے خود اپنی خطا تسلیم کی!

یکایک ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا! آج روہنی نے کیوں مجھ سے یہ باتیں کہیں۔ جو کام کرنے کو وہ اپنے لئے بیس سال راضی نہ کر سکی۔ وہ آج

کیوں کر بیٹھی۔ اِس سوال نے راجہ صاحب کے دِل کو دہشت سے مغلوب کردیا آج روہنی کے چہرے پر کیسی حسرت چھائی ہوئی تھی۔ باتیں کرتے وقت اسکی آنکھیں پھڑ پھڑاتی تھیں۔ اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ اُسکے چہرے پر اتنی بیکسی کبھی نظر نہ آئی تھی۔ وہاں تو غرور کی سُرخی جھلکتی رہتی تھی۔ اُنہیں دیکھتے ہی وہ غرور سے گردن اٹھا کر مُنہ پھیر لیا کرتی تھی۔ آج یہ تغیر کیوں ہوا۔

راجہ صاحب جیوں جیوں اِس معاملے پر غور کرتے ان کی دہشت بڑھتی جاتی تھی۔ آدھی رات سے زیادہ گذر گئی تھی۔ رنواس میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مگر ان کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ ان کا دِل اِس خوف سے بے تاب ہو رہا تھا۔ آخر اُن سے ضبط نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ روہنی کے کمرے کی اور چلے۔ اُس کی ڈیوڑھی پر چوکیدارنی سے ملاقات ہوئی۔ اُنہیں اس وقت یہاں دیکھ کر وہ سکتہ میں آگئی۔ جس مکان میں انہوں نے بیس برس تک قدم نہیں رکھا۔ اُدھر آج کیسے بُھول پڑے۔

راجہ صاحب نے پوچھا۔ چھوٹی رانی کیا کر رہی ہیں۔

چوکیدارنی نے کہا۔ اس وقت تو سرکار سو رہی ہونگی۔ مہاراج کا کوئی پیغام ہو تو پہونچا دوں۔

راجہ نے کہا۔ نہیں میں خود جا رہا ہوں تو یہیں رہ۔

راجہ صاحب نے کمرے کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اندر کیطرف جھانکا روہنی مسہری کے اندر چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ وہ اندر قدم رکھتے ہوئے جھجکے۔ اندیشہ ہوا کہیں روہنی اٹھ کر کہہ نہ بیٹھے۔ آپ یہاں کیوں آئے۔ وہ اسی دُبدھے میں آدھ گھنٹے تک کھڑے رہے۔ کئی بار آہستہ آہستہ پکارا

بھی پر روہنی نہ منکی۔ اتنی دیر میں اُس نے ایک بار بھی کروٹ نہ لی۔ یہاں تک کہ اس کی سانس بھی نہ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مکر کئے پڑی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ راجہ صاحب کیا کرتے ہیں۔ شاید امتحان لے رہی ہے کہ اب بھی ان کا دِل صاف ہوا یا نہیں۔ نیند میں غافل پڑے ہوئے آدمی کا تنفس اتنا خاموش نہیں ہو سکتا۔ ضرور دم سادھے پڑی ہوئی ہے۔ مجھے شاید میری آہٹ پاکر چادر اوڑھ لی ہوگی۔ اس کے مزاج میں ظرافت بھی تو بہت ہے۔ پہلے بھی تو اسی طرح کی نقلیں کیا کرتی تھی۔ اس کی ظرافت اور تمسخر کی صدہا روایتیں یاد آگئیں۔ انہوں نے ہمت کرکے کمرے میں قدم رکھا۔ پر اب بھی کسی طرح کی آواز نہ سُنکر اُنہیں خیال آیا۔ کہیں روہنی نے جھوٹ موٹ تو چادر تو نہیں تان دی ہے۔ اُنہیں ایک پُرانا واقعہ یاد آیا۔ جب روہنی نے ان کے ساتھ اِس طرح کی دِل لگی کی تھی۔ اور یہ کہہ کر اُنہیں خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا: آپ کی بیوی تو وہ ہے۔ جسے آپ نے جگایا ہے۔ جا لیئے اُنہیں سے ہنسئے بولیئے۔ آج بھی شاید وہ وہی نقل کر رہی ہے۔ اِس موقع کے لئے کوئی چبھتا ہوا فقرہ سوچ رکھا ہوگا۔ راجہ صاحب کا ساٹھواں سال تھا لیکن اِس وقت اِس راز و نیاز میں اُنہیں شباب کا سا لطف آرہا تھا وہ دکھانا چاہتے تھے کہ وہ اسکی چال تاڑ گئے۔ وہ اُنہیں دھوکا نہ دے سکی لیکن جب آدھ گھنٹے تک کھڑے رہنے پر بھی کوئی آواز یا آہٹ نہ ملی۔ تو انہوں نے چاروں طرف چوکنی آنکھ سے دیکھ کر آہستہ سے چادر ہٹا دی۔ روہنی سوئی ہوئی تھی۔ لیکن جب جھک کر اُسکے چہرے کیطرف دیکھا۔ تو چونک کر پیچھے ہٹ گئے۔ وہ روہنی نہ تھی، روہنی کی لاش تھی! بیس برس کی فکر، غم، حسد، اور مایوسی نے اس کے خستہ جسم کو گھلا ڈالا تھا۔ اُن بے جان

ساکن اور پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اب بھی ایک آرزو ئے تشنہ جھلک رہی تھی۔ دونوں بے نور آنکھیں اس کی حسرت ناک زندگی کی دو شرحیں تھیں۔ زندگی کی ساری ناکامیاں۔ ساری حسرتیں گویا وہاں ماتم کر رہی تھیں۔ دو دلدوز تیروں کی طرح راجہ صاحب کے دل میں چبھی جا رہی تھیں۔ گویا کہہ رہی تھیں۔ اب تو تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ اب میٹھی نیند سوؤ۔ مجھے تمہاری پرواہ نہیں ہے۔

راجہ صاحب نے دونوں آنکھیں بند کر لیں اور رونے لگے۔ ان کا ضمیر اس انسانیت سوز بیرحمی پر ان کی ملامت کر رہا تھا۔ کسی آدمی کے ساتھ اپنے فرض کا خیال ہمیں اسکے مرنے کے بعد ہی آتا ہے۔ ہائے! ہم نے اسکے ساتھ کچھ نہ کیا۔ یہ وہی رانی تھی۔ جس پر ایک دن وہ اپنی جان نثار کرتے تھے اور آج وہ اس بیکسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہیں۔ کوئی تشفی دینے والا بھی نہیں۔ راجہ صاحب کو اب روہنی کی باتوں کا راز سمجھ میں آیا۔ وہ انہیں آگاہ کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی عقل پر ایسا پردہ پڑ گیا تھا۔ کہ وہ اس وقت بھی کچھ نہ سمجھے۔ اسوقت بھی اگر انہوں نے ایک بار خلوص دل سے کہا ہوتا۔ میری جان! میری خطائیں معاف کر دو! تو شاید اس دکھیا کے آنسو پچھ جاتے۔ وہ آخر وقت میں انکے پاس عفو کا پیغام لے کر گئی تھی۔ پر وہ کچھ نہ سمجھے۔ امید کی آخری تحریک اسے ان کے پاس لے گئی۔ مگر افسوس .....

یکایک راجہ صاحب کو خیال آیا۔ شاید ابھی اس کی جان بچ جائے۔ انہوں نے چوکیدارنی کو پکارا اور بولے۔ ذرا جاکر دربان سے کہدے۔ جاکر ڈاکٹر صاحب کو بلا لائے۔ یہ بڑھیا رانی دیو پریا کے زمانہ کی عورت تھی۔ روہنی کے زرد چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ڈاکٹر کو بلا کر کیا کر دگے۔ رانی اب اس لوک میں چلی گئیں

جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ ابھاگنی مرجاد ڈھوتی رگئی۔ اسکے اوپر کیا کیا گذری، تم کیا جانو گے۔ تم تو بڑھاپے میں شادی کرکے عقل اور حیا دونوں ہی کھو بیٹھے۔ اسکے اوپر جو کچھ گذری۔ وہ میں جانتی ہوں۔ ہائے! خون کے آنسو روکر بیچاری مرگئی اور تمہیں درد نہ آیا۔ کیا سمجھتے ہو اسنے زہر کھالیا؟ اس ڈھانچے سے جان کو نکالنے کے لئے زہر کی ضرورت نہ تھی۔ اسکے مرنے کا تعجب نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ وہ اتنے دن زندہ کیسے رہی۔ جو دل جوئی تم آج کر رہے ہو۔ اگر وہ پہلے کی ہوتی تو اسکے لئے وہ امرت ہوجاتی۔

دم زدن میں رنواس میں شور مچ گیا۔ رانی روہنی نے انتقال کیا۔ سبھی رانیاں، باندیاں آکر جمع ہوگئیں۔ مگر منورما نہ آئی۔

(۱۷)

روہنی کی وفات کے بعد راجہ صاحب جگدیش پور نہ رہ سکے۔ منورما کا جی بھی وہاں گھبرانے لگا۔ وہ اس خیال کو دل سے نہ نکال سکتی تھی۔ کہ میں ہی روہنی کے بے وقت موت کا سبب ہوئی۔ راجہ صاحب کی نگاہ بھی اب اس کی طرف سے پھری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب خزانچی اُتنے مستعدی سے اُسکی فرمائشیں نہیں پوری کرتا۔ راجہ صاحب بھی اب اُسکے پاس بہت کم آتے ہیں۔ یہاں تک کہ گردسیوک کو جواب دیدیا گیا ہے۔ اور رنواس میں آنے کی ممانعت کردی گئی ہے روہنی نے اپنے کو قربان کرکے منورما پر فتح پائی ہے۔ اب بسومتی اندرام پر یا پر راجہ صاحب کی کچھ خاص نظر عنایت ہے۔ ریاست میں اب اندھیر بھی زیادہ ہونے لگا ہے۔ منورما کے کھولے ہوتے مدرسے بند ہوتے جاتے ہیں کسانوں پر بھی کچھ زیادہ سختی ہونے لگی ہے۔ منورما سب دیکھتی اور سمجھتی ہے۔ مگر منہ نہیں

کھول سکتی۔ اس کا ستارہ اقبال زوال پر ہے۔ وہی راجہ صاحب جو اسکے بغیر کہیں سیر کرنے بھی نہ جاتے تھے۔ اب ہفتوں اس کی طرف جھانکتے تک نہیں نوکروں پر بھی اب اسکا رُعب نہیں رہا۔ ان گنواروں کو ہوا کا رخ پہچانتے دیر نہیں لگتی۔ روہنی کی قربانی رائیگاں نہیں ہوئی۔

شنکھدھر کو اب ایک نئی فکر ہو گئی ہے۔ راجہ صاحب کے روٹھنے سے چھوٹی رانی مر گئیں۔ بابو جی کے روٹھنے سے اماں کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ دیکھتا ہے اہلیا روز بروز گھلتی جاتی ہے۔ اس سے اُسے بڑی تشویش پیدا ہو گئی ہے اسکا نام اسکول میں لکھا دیا گیا ہے۔ اسکول سے چھٹی پاکر وہ سیدھے ٹونگی کے پاس جاتا ہے اور اُس سے تیرتھ یاترا کی باتیں پوچھتا ہے۔ یاتری کیا کھاتے ہیں، کہاں ٹھہرتے ہیں، جہاں ریلیں نہیں ہیں۔ وہاں لوگ کیسے جاتے ہیں، راستے میں چور تو نہیں ملتے؟ ٹونگی اس کے دل کی کیفیت سمجھتی ہے۔ لیکن خواہش نہ ہونے پر بھی اُسے ساری باتیں بتانی پڑتی ہیں۔ وہ جھنجھلاتی ہے، گھڑک بیٹھتی ہے۔ لیکن جب وہ بھولا بھالا لڑکا زبردستی اسکے گود میں بیٹھ جاتا ہے تو اُسے رحم آجاتا ہے۔ چھٹیوں کے دن شنکھدھر اپنے باپ کے گھر کا درشن کرنے ضرور جاتا۔ وہ گھر اس کے لئے ایک متبرک مقام ہے جبتک وہ وہاں رہتا ہے اسپر بھگتی کا نشہ سا چھایا رہتا ہے۔ نرملا کی آنکھیں اس کی دید سے سیر ہی نہیں ہوتیں۔ اُسکے گھر میں آتے ہی روشنی سی پھیل جاتی ہے دادا اور دادی دونوں اس کی طفلانہ سرگرمی سے بھری باتیں سُنکر مست ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ چکر دھر ہی اس شکل میں ان کا غم غلط کرنے آتا ہے۔

ایک دن نرملا نے کہا۔ بیٹا تم یہیں آکے کیوں نہیں رہتے۔ تم چلے جاتے ہو

تو یہ گھر کاٹنے دوڑتا ہے۔

شنکھدھر نے کچھ سوچکر متانت سے کہا۔ اماں تو آتی ہی نہیں۔ وہ یہاں کیوں نہیں آتیں دادی جی!

نرملا۔ اب یہ تو وہی جانیں۔ تم کبھی پوچھتے نہیں؟ آج پوچھنا۔ دیکھو کیا کہتی ہیں۔

شنکھدھر۔ نہیں دادی وہ رونے لگیں گی۔ جب تھوڑے دنوں میں میں گدی پر بیٹھوں گا۔ تو یہی گھر میرا شاہی محل ہوگا۔ تبھی اماں جی آویں گی۔

نرملا۔ جلدی سے بیٹھو بیٹا۔ ہم بھی دیکھ لیں۔

شنکھدھر۔ میں بابو جی کے نام سے ایک اسکول کھولوں گا۔ دیکھ لینا اس میں کسی لڑکے سے فیس نہ لیجائے گی۔

بجر دھر۔ اور ہمارے لئے کیا کروگے بیٹا؟

شنکھدھر۔ آپکے لئے اچھے اچھے ستار یئے بلواؤں گا۔ آپ ان کا گانا سنا کیجئے گا۔ آپکو یہ فن کس نے سکھایا۔

بجر دھر۔ میں نے یہ فن ایک مہاتما سے سیکھا۔ برسوں ان کی خدمت کی تب جاکر خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھے ایسی دعا دی۔ کہ تھوڑے ہی دنوں میں میں اس فن میں مشاق ہوگیا۔ تم بھی سیکھ لو بیٹا! میں بڑے شوق سے سکھاؤنگا اصل میں یہ فن راجوں مہاراجوں کے لیے تو ہے ہی۔ وہی تو اہل کمال کی قدر کرسکتے ہیں۔ جسے یہ علم آگیا۔ اُسے زندگی میں کسی بات کی کمی نہ رہے گی۔ وہ جہاں رہے گا۔ لوگ اُسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ میں نے تو اسی علم کی بدولت بدری ناتھ کی یاترا کی تھی۔ جس گاؤں میں شام ہوجاتی، کسی بھلے آدمی کے دروازے پر چلا جاتا اور دو چار چیزیں سنا دیتا۔

ششنکھدھر نے حیرت میں آکر پوچھا۔ سچ؟ تب تو میں ضرور سیکھونگا۔

بجر دھر۔ ضرور سیکھ لو۔ لاؤ میں آج ہی سے شروع کر دوں۔

ششنکھدھر کو گانے اور بجانے کا خاص ذوق تھا۔ ٹھاکردوارے میں جب کیرتن ہوتا۔ تو وہ بڑے شوق سے سُنتا تھا۔ خود بھی تخلیہ میں بیٹھا گنگنا یا کرتا تھا ایک بار بھی کوئی راگ سُن لیتا تو وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی۔ جوگیوں کے کتنے ہی گیت اُسے یاد تھے۔ کھنجری بجا بجاکر وہ سور، کبیر۔ میرا وغیرہ باکمالوں کے پدگایا کرتا تھا۔ اس وقت جو اُس نے کبیر کا ایک پد گایا تو منشی جی لٹو ہو گئے بیٹا تمہیں تو میں تھوڑے دنوں میں ایسا بنا دوں گا۔ کہ اچھے اچھے استاد کانوں پر ہاتھ دھریں۔ بس تم میرے نام پر ایک موسیقی کا اسکول کھول دینا۔

ششنکھدھر۔ جی ہاں! اسمیں گانے کی تعلیم دیجائے گی۔

نرملا۔ اور اتنی بڑھیا دادی کے لیئے کیا کروگے بیٹا؟

ششنکھدھر۔ تمہارے لیئے ایک ڈولی بنوا دوں گا۔ اسی پر بیٹھکر تم روز گنگا اشنان کرنے جانا۔

نرملا۔ میں ڈولی پر نہ بیٹھوں گی۔ لوگ ہنسیں گے۔

اس طرح دونوں آدمیوں کا دل بہلاکر جب ششنکھدھر چلنے لگا تو نرملا دروازے تک اسکے پیچھے آئی۔

یکایک ششنکھدھر ڈیوڑھی میں کھڑا ہو گیا اور بولا۔ دادی جی آپ سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔

نرملا نے پوچھا۔ کیا مانگتے ہو بیٹا؟

ششنکھدھر۔ آپ مجھے دعا دیجئے کہ میری دلی مُراد بر آئے۔

نرملا نے اُسے گلے سے لگا کر کہا۔ بھیا میرا تو رویاں رویاں تمہیں دُعا دیا

کرتا ہے۔ ایشور تمہاری ساری مُرادیں پوری کرے ؀

شنکھدھر نے اُس کے چرنوں پر سر جھکایا اور موٹر پر جا بیٹھا۔ نرملا چوکھٹ پر کھڑی موٹر کیطرف تاکتی رہی۔ موٹر پرجاتے ہی موٹر تو اسکے آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ مگر نرملا اس وقت تک وہاں سے نہ ہٹی۔ جب تک اس کی آواز کانوں میں آتی رہی ؀

شنکھدھر گھر پہونچا تو اہلیا نے پوچھا۔ آج اتنی دیر کہاں لگائی بیٹا؟ میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔

شنکھدھر۔ ابھی تو ایسی بہت دیر نہیں ہوئی اماں۔ ذرا دادی کے پاس چلا گیا تھا۔ انہوں نے تو آج مجھے ایک پیغام کہلا بھیجا ہے۔

اہلیا۔ کیا پیغام ہے سُنوں؟

شنکھدھر۔ یہی کہ تم کبھی کبھی وہاں کیوں نہیں چلی جاتیں؟

اہلیا۔ کیا کچھ کہتی تھیں؟

شنکھدھر۔ کہتی تو نہیں تھیں۔ پر ان کی خواہش ایسی ہی معلوم ہوتی تھی کیا اسمیں کچھ ہرج ہے۔

اہلیا نے اوپری دل سے یہ تو کہہ دیا۔ ہرج کچھ نہیں گھر تو میرا وہی ہے یہاں تو مہمان ہوں۔ لیکن اُسکے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ وہاں جانا مناسب نہیں سمجھتی۔ خیر وہ کہہ سکتی تو کہتی۔ وہاں سے تو ایک بار نکال دی گئی۔ اب کون منہ لیکر جاؤں۔ کیا اب میں کوئی دوسری ہوگئی ہوں۔

اہلیا طشتریوں میں میوے اور مٹھائیاں لائی اور بولی۔ وہاں تو کچھ کھایا نہ ہوگا آج اتنے اوداس کیوں ہو؟

شنکھدھر نے طشتری کی طرف ذرا دیکھتے ہی کہا۔ اس وقت تو کھانے

کو جی نہیں چاہتا اماں۔

ایک لمحہ کے بعد اُس نے کہا۔ کیوں اماں بابو جی کو ہم لوگوں کی یاد بھی کبھی آتی ہوگی؟

اہلیا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ کیا جانیں بیٹا، یاد ہی آتی تو کالے کوسوں کیوں بیٹھے رہتے۔

شنکھدھر۔ کیا اُنہیں ہم لوگوں کی محبت نہیں آتی۔؟

اہلیا رو رہی تھی کچھ نہ بول سکی۔

شنکھدھر۔ مجھے دیکھیں تو پہچان جائیں کہ نہیں۔؟

اہلیا۔ پھر بھی کچھ نہ بولی۔ اس کی آواز آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوبی جا رہی تھی۔

شنکھدھر نے پھر کہا۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے ہی نرموہی ہیں۔ اِسی سے تو اُنہیں ہم لوگوں کی یاد نہیں آتی۔ مجھے ایک دفعہ مِل جاتے تب تو میں اُنہیں قائل کر دیتا۔ آپ نہ جانے کہاں بیٹھے ہیں کسی کی سُدھ ہی نہیں میرا تو کبھی ایسا جی چاہتا ہے کہ میں تو صاف کہہ دوں۔ آپ میرے ہوتے کون ہیں آپ ہی نے تو ہم لوگوں کو بھلا رکھا ہے۔

اب اہلیا چپ نہ رہ سکی۔ رقت آمیز لہجہ میں بولی۔ انہوں نے ہمیں بھلا نہیں دیا ہے۔ وہاں ان کی جو حالت ہوگی۔ وہ میں جانتی ہوں۔

شنکھدھر نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ کیوں اماں مجھے دیکھیں تو پہچان جائیں یا نہیں۔؟

اہلیا۔ میں تو سمجھتی ہوں نہ پہچان سکیں۔ تب تم بالکل ذرا سے تھے۔ آج انکو گئے دسواں سال ہے۔ میں تو تمہیں دیکھ دیکھ جیتی ہوں۔ وہ کس کو دیکھکر دِل کو

تسکین دیتے ہونگے۔

شنکھدھر۔ اپنی ہی دھن میں مست تھا، بولا۔ لیکن میں تو اُنہیں دیکھ کر فوراً پہچان جاؤں۔

اہلیا۔ نہیں بھیتا تم بھی اُنہیں نہ پہچان سکوگے۔ تم نے ان کی تصویریں ہی تو دیکھی ہیں۔ وہ تصویریں بارہ سال پہلے کی ہیں۔

شنکھدھر نے کچھ جواب نہ دیا۔ باغیچہ میں جا کر پھول توڑنے لگا پھر اپنے کمرے میں آیا اور چُپ چاپ بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کیا میں ایسا بہت چھوٹا ہوں میرا تیرھواں سال ہے چھوٹا نہیں ہوں۔ اس عمر میں کتنے ہی آدمیوں نے بڑے بڑے کام کر ڈالے ہیں۔ مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ دن بھر گلیوں میں گھومنا اور شام کو کہیں پڑ رہنا۔ یہاں لوگوں کی کیا حالت ہوگی۔ اس کی اُسے فکر نہ تھی راجہ صاحب پاگل ہو جائیں گے۔ منورما روتی روتی اندھی ہو جائے گی۔ اہلیا شاید جان ہی دیدے۔ مگر اس کی اُسے بالکل فکر نہ تھی۔ وہ یہاں سے بھاگ نکلنے کو بیقرار ہو رہا تھا۔

یکایک اُسے خیال آیا، ایسا نہ ہو یہ لوگ میری تلاش میں نکلیں۔ تھانے میں حلیہ لکھائیں۔ خود بھی پریشان ہوں۔ مجھے بھی پریشان کریں۔ اسلئے اُنہیں اتنا بتلا دینا چاہیے کہ میں کہاں اور کس کام کے لئے جا رہا ہوں۔ اگر کسی نے مجھے زبردستی لانا چاہا۔ تو اچھا نہ ہوگا۔ ہماری خوشی ہے۔ جب چاہینگے آئینگے۔ ہمارا راج تو کوئی نہ اٹھا لے جائے گا۔ اس نے کاغذ پر ایک خط لکھا۔ اور اپنے بستر پر رکھدیا۔

میں آج اپنی خوشی سے بابو جی کی تلاش میں جاتا ہوں۔ آپ لوگ میرے لئے ذرا بھی فکر نہ کیجیے گا۔ نہ مجھے تلاش کرنے کے لئے آیئے گا۔ کیونکہ میں کسی حالت میں

بابوجی کا پتہ لگائے بغیر نہ آؤں گا۔ جب تک ایک بار ان کے درشن نہ کرلوں اور پُوچھ نہ لوں۔ کہ مجھے کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ تب تک میرا جینا بیکار ہے۔ میں یا تو بابوجی کو ساتھ لے کر لوٹوں گا۔ یا اسی کوشش میں جان دیدونگا اگر میری تقدیر میں راج کرنا لکھا ہے تو راج کرونگا۔ بھیک مانگنا لکھا ہے تو بھیک مانگونگا۔ لیکن بابوجی کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگائے اور ان کی کچھ خدمت کیئے بغیر میں گھر نہ آؤں گا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے واپس لانے کی کوئی فکر نہ کرے۔ نہیں تو میں جان دے دوں گا۔ میرے لیئے یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ بابوجی تو چاروں طرف مارے مارے پھریں اور میں گھر میں چین سے بیٹھا رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں برداشت ہوتا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں چھوٹا ہوں، بھول بھٹک جاؤں گا۔ میں نے یہ ساری باتیں اچھی طرح سوچ لی ہیں۔ روپے پیسے کی بھی مجھے ضرورت نہیں اماں! میری آپ سے یہی التجا ہے۔ کہ آپ دادی کی خدمت کیجئے گا۔ اور انہیں سمجھایئے گا کہ میرے لئے فکر نہ کریں رانی اماں اور بابا کو پرنام!

آدھی رات گذر چکی تھی شنکھدھر ایک کرتہ پہنے گھر سے نکلا۔ بغل کے کمرے میں راجہ صاحب آرام کر رہے تھے۔ وہ عقب کی طرف باغ میں گیا اور ایک امرود کے درخت پر چڑھکر باہر کی طرف کود پڑا۔ اب اسکے سر پر تاروں سے جگمگاتا ہوا آسمان تھا۔ سامنے وسیع میدان۔ اور سینے میں اُمید۔ خوف اور آرزوؤں سے تڑپتا ہوا دل۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چلا۔ کچھ نہیں معلوم کدھر جارہا ہے۔ تقدیر کہاں لئے جاتی ہے۔

ایسی ہی اندھیری رات تھی۔ جب چکردھر نے اس گھر سے مُنہ موڑا تھا۔ آج بھی وہی اندھیری رات ہے اور بھاگنے والا چکردھر کا بیٹا ہے۔ کون جانتا

ہو چکر دھر پر کیا بیتی۔ شنکھ دھر پر کیا بیتے گی۔ اسے بھی کون جان سکتا ہے۔ اس گھر میں انہیں کون سی آسائش نہیں تھی۔ کیا ایسی بھی کوئی چیز ہے جو اس ثروت اور آسائش اور راج پاٹ سے زیادہ پیاری ہے۔

بدنصیب اہلیا تو بڑی سو رہی ہے۔ ایک بار تم نے اپنا شوہر کھویا اور ابھی تک تیری آنکھوں سے آنسو نہیں تھمے۔ آج پھر تو اپنا پیارا بیٹا، اپنا لخت جگر کھوئے دیتی ہے۔ جس ثروت کے لئے تو اپنے شوہر سے ہاتھ دھو بیٹھی وہی ثروت کیا آج تجھے اجیرن ہو رہی ہے؟

(۴۲)

پانچ سال گذر گئے۔ مگر نہ کہیں شنکھ دھر کا پتہ چلا نہ چکر دھر کا۔ راجہ بشال سنگھ نے رحم اور انصاف کو خیر باد کہہ دیا ہے اور خوب دل کھول کر ظلم کر رہے ہیں۔ رحم اور انصاف سے جو کچھ ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ حاصل کر لینے کے بعد وہ اب یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ سختی اور ظلم سے کیا ہوتا ہے۔ ریاست میں ثواب کے جتنے کام ہوتے تھے۔ وہ سب بند کر دیئے گئے ہیں۔ مندروں میں چراغ نہیں جلتے۔ سادھو سنت دروازے سے کھڑے کھڑے نکال دیئے جاتے ہیں۔ غریب رعایا کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔ راجہ صاحب کو کسی پر رحم نہیں آتا۔ اب کیا گیا ہے جس کے لئے وہ نیکی اور حق کا دامن پکڑیں۔ وہ لاڈلا اب کہاں ہے جس کی دیدار سے ہی آنکھوں کو سرور ہوتا تھا۔ وہ زندگی اور موت کی سبھی آرزوؤں کا مرکز کہاں چلا گیا۔ اگر ایشور نے ان کے اوپر یہ ستم ڈھائے ہیں تو وہ بھی اسی کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اتنے آدمیوں میں صرف منورما ہے جس نے ابھی تک صبر اور توکل کا دامن نہیں چھوڑا۔

لیکن اس کی اب کوئی نہیں سنتا۔ راجہ صاحب اب اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ اسی کو اِن ساری مصیبتوں کا باعث سمجھتے ہیں۔ وہی منورما جو اُنکے دِل کی رانی تھی۔ جس کے اشارے پر ریاست چلتی تھی۔ اب کسم مپرسی کیحالت میں پڑی ہوئی ہے۔

شام ہوگئی ہے۔ روشنی کا دیوتا پہاڑیوں کے آڑ میں چھپ گیا۔ عورتیں پانی بھرنے کو پنگھٹ پر جمع ہوگئی ہیں۔ اسی وقت ایک نوجوان ہاتھ میں کھنجڑی لیے آکر کنوئیں کے جگت پر بیٹھ گیا۔ یہی شنکھدھر ہے۔ اسکے رنگ روپ اور خط وخال میں اتنا تغیر ہوگیا ہے۔ کہ شاید اہلیا بھی اُسے دیکھ کر چونک پڑتی اسکے چہرے پر ایسی نقاہت ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کی جان نکلنے کے لیے بیقرار ہو رہی ہے۔ اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں تمنا اور انتظار کی جگہ اب مایوسی کا سکون ہے۔ اُس مایوسی کا جس کا کوئی علاج نہیں۔ گویا کوئی گھر سے یتیم یا سزا سے بیکس ہو۔ پانچ سال کی سخت کشمکش حیات نے اُسے اتنا دل شکستہ کردیا ہے۔ کہ شاید اپنے مطلوب کو سامنے دیکھ کر بھی اُسے آنکھوں پر یقین نہ آتا۔

ایک حسینہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کہاں سے آئے ہو پردیسی۔ بیمار معلوم ہوتے ہو۔

شنکھدھر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ بیمار تو نہیں ہوں۔ دُور سے آتے آتے تھک گیا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنی کھنجڑی اٹھالی۔ اور اس پر یہ گیت گانے لگا۔

مست مئے وحدت ہوں کعبہ ہو کہ بُت خانہ
ہر جا نظر آتا ہے وہ جلوۂ جانانہ

ساقی میں بہک اٹھوں کمظرف نہیں ایسا
اور دیئے جاؤ تو ساغر ہو کہ پیمانہ
کعبہ کی طرف جاؤں کیا اسکی ضرورت ہے
کافی ہے پئے سجدہ مجھ کو درِ مے خانہ
ہاں ساقئے کوثر کا دیدار میسّر ہو
لبریز ہوا اے ساقی جب عمر کا پیمانہ
یوں چور ہو اے باسطؔ تو بادۂ عرفاں سے
بن جائے تیری رہبر ہر لغزش مستانہ

اس خستہ حال نوجوان کے گلے میں اتنا لوچ تھا آواز اتنی دلکش اور لہجہ اتنا مستی میں ڈوبا ہوا کہ وہ نازنینیں محویت کے عالم میں کھڑی رہ گئیں کوئی کنوئیں میں کلسا ڈالے ہوئے اُسے کھینچنا بھول گئی۔ کوئی کلسے میں رسی کا پھندا لگاتے ہوئے اُسے کنوئیں میں ڈالنا بھول گئی۔ اور کوئی کولھے پر کلسا رکھے آگے بڑھنا بھول گئی۔

ایک حسینہ نے پوچھا۔ باباجی اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ یہیں ٹھہر جاؤ نا آگے تو بہت دُور تک کوئی گاؤں نہیں ہے۔

سُنگھدھر۔ آپکی مرضی ہے ماتاجی تو یہیں ٹھہر جاؤں گا۔ یہاں کوئی مہاتما تو نہیں رہتے۔؟

عورت نے کہا۔ نہیں۔ یہاں تو کوئی سادھو سنت نہیں ہیں۔ ہاں مندر ہے۔

دوسری بولی۔ ابھی کئی دن ہوئے ایک مہاتما آکر ٹکے تھے۔ مگر کل چلے گئے۔

ایک بڑھیا نے کہا۔ سادھو سنت تو بہت دیکھے۔ مگر ایسا اوپکاری آدمی نہیں دیکھا۔ تمہارا گھر کہاں ہے بیٹا؟

ششنکھدھر۔ کہاں بتاؤں ماتا۔ یوں ہی گھومتا پھرتا ہوں۔

بڑھیا۔ تمہارے ماں باپ تو ہوں گے۔

ششنکھدھر۔ کچھ معلوم نہیں۔ پانچ سال ہوئے۔ باپ کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ تب سے ماں کا حال بھی نہیں معلوم۔

بڑھیا۔ تمہارے باپ کیوں چلے گئے۔؟

ششنکھدھر۔ دنیا کے جھگڑوں میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے اور کیا۔ پانچ سال سے تلاش کر رہا ہوں۔ پر کہیں پتہ نہیں چلا۔

ایک جوان عورت نے اپنی سہیلی کے کندھے سے منہ چھپا کر کہا۔ ان کا بیاہ تو ہو گیا ہو گا۔

سہیلی ششنکھدھر کے منہ کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ یکایک وہ ضعیفہ سے بولی۔ اماں ان کی صورت رانا سے ملتی ہے کہ نہیں۔ کچھ معلوم ہوتا ہے۔

بڑھیا۔ ہاں کچھ کچھ معلوم تو ہوتا ہے۔ کیوں بیٹا! تمہارے باپ کی عمر کیا ہو گی؟

ششنکھدھر۔ یہی کوئی چالیس سال کی ہو گی۔

بڑھیا۔ آنکھیں خوب بڑی بڑی ہیں۔؟

ششنکھدھر۔ ہاں ماتا جی۔ اتنی بڑی آنکھیں تو میں نے کسی کی دیکھی ہی نہیں۔

بڑھیا۔ لمبے لمبے گورے آدمی ہیں۔؟

ششنکھدھر کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ بولا۔ ہاں ماتا جی ٹھیک ایسے ہی ہیں۔

بڑھیا۔ اچھا داہنی طرف ماتھے پر کسی چوٹ کا داغ ہے؟

شنکھدھر۔ ہو سکتا ہے ناتا جی۔ میں نے تو صرف ان کی تصویر دیکھی ہے۔
تب تو میں کل دو تین سال کا تھا۔ کچھ بتا سکتی ہو وہ ناتا کدھر گئے۔

بڑھیا۔ یہ تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ پر وہ اُتر کی طرف گئے ہیں۔ تم سے کیا کہوں بیٹا۔ مجھے تو انہوں نے موت کے منہ سے نکال لیا۔ ندی میں نہانے گئی تھی پیر پھسل گیا۔ وہ ناتا جی کنارے بیٹھے دھیان کر رہے تھے۔ مجھے ڈبکیاں کھاتے دیکھا تو جھٹ پانی میں کود پڑے۔ اور مجھے نکال لیا۔

ایک سیٹھ نے کہا۔ یہاں ان کی ایک تصویر بھی رکھی ہوئی ہے۔

بڑھیا۔ ہاں اس کی تو مجھے یاد ہی نہ رہی تھی۔ اس گاؤں کا ایک آدمی بمبئی میں تصویر بناتا ہے۔ اُسی نے ان کی تصویر اتار لی۔ نہ جانے اس کے پاس کیسی ڈبیا ہے کہ جس کے سامنے کھڑا کر دو اس کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔

شنکھدھر نے بیتاب ہو کر کہا۔ ذرا وہ تصویر مجھے دکھا دیجئے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

سیٹھنی لپکی ہوئی گھر گئی اور ایک لمحہ میں تصویر لے کر لوٹ آئی۔ شنکھدھر کی اس وقت عجیب حالت تھی۔ اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تصویر دیکھے۔ کہیں یہ چکردھر کی تصویر نہ ہو۔ تو اُسے کتنا صدمہ ہوگا۔ اگر انہیں کی تصویر ہوئی تو وہ کیا کرے گا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا رہ سکے گا۔ اُسے غش تو نہ آ جائے گا اگر یہ چکردھر کی تصویر ہوئی تو شنکھدھر کو ایک نئی فکر پیدا ہو جائے گی کیا وہ چکردھر کے پاس جائے گا۔ جا کر کیا کہے گا۔ اُسے وہ پہچان سکیں گے اُسے دیکھ کر وہ خوش ہوں گے یا دُتکار دیں گے۔ اس طرح سے سینکڑوں سوالات اسکے دل میں پیدا ہونے لگے۔ بڑھیا نے جب وہ تصویر اسکے ہاتھ میں دی تو اس نے دل کو ایک ہاتھ سے سنبھال کر تصویر پر ایک سہمی ہوئی نگاہ ڈالی۔

اور فوراً پہچان گیا۔ ہاں یہ چکر دھر ہی کی تصویر تھی۔ شنکھدھر کے اعضا جیسے شل ہو گئے۔ دل کی حرکت جیسے بند ہو گئی۔ امید اور بیم فکر اور پریشانی سے مغلوب ہو کر وہ سکتہ کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔

بڑھیا نے پوچھا۔ بیٹا کچھ پہچان رہے ہو؟

شنکھدھر نے کوئی جواب نہ دیا۔ گویا کچھ سُنا ہی نہیں۔

دفعتاً اُس نے نیند سے جاگے ہوئے آدمی کی طرح پوچھا۔ آپ نے کہا وہ اُتر کی طرف گئے ہیں۔ آگے کوئی گاؤں پڑے گا۔؟

بڑھیا۔ ہاں بیٹا۔! پانچ کوس پر ایک گاؤں ہے "سائیں گنج"، لیکن آج تو تم یہیں ٹھہرو گے؟

شنکھدھر نے صرف اتنا ہی کہا۔ نہیں ماتا جی اب اجازت دیجئے۔ اور گٹھڑی اُٹھا کر چل کھڑا ہوا۔ عورتیں تاکتی رہ گئیں ۔

(۴۳)

رات کی اُس عمیق اور شدید تاریکی میں شنکھدھر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ اُسکے پاؤں پتھر کے ٹکڑوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ سارا جسم غلبہ ماندگی سے چُور چُور ہو گیا تھا۔ بھوکھ کے مارے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا جاتا تھا۔ اور پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑے ہوتے تھے۔ پیر کہیں رکھتا تھا: کہیں پڑتے تھے۔ پر گرتا پڑتا، بھاگتا چلا جاتا تھا۔ اگر وہ طلوع سحر تک سائیں گنج نہ پہونچا تو ممکن ہے۔ چکر دھر کہیں اور چلے جائیں۔ اور اس بیکس کی پانچ سال کی پریشانی اور دوا دوش خاک میں مل جائے۔

خونخوار درندوں کی مہیب صدائیں کان میں آتی تھیں۔ اور اُس کا خون

سرد ہو جاتا تھا۔ اندھیرے میں کھڈ اور ٹیلے میں تمیز نہ ہوتی تھی۔ پر وہ جان ہتھیلی پر لئے ہوئے تھا۔ دُھن تھی تو یہ کہ سورج دیوتا کے درشن سائیں گنج میں ہوں۔

افق مشرق میں سرخی چھا گئی۔ تارے کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح آنکھیں بند کر کے آرام کرنے لگے۔ چڑیاں شاخوں پر چہکنے لگیں۔ پر سائیں گنج کا کہیں پتہ نہ تھا۔

دفعتاً ایک بہت دُور کی پہاڑی پر چند چھوٹے چھوٹے مکانات لڑکیوں کے گھروندوں کی طرح نظر آئے۔ وہ سائیں گنج آ گیا۔ شنکھدھر کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اُس کے نیم جان جسم میں غیر معمولی چُستی پیدا ہو گئی۔ اس نے اور تیزی سے قدم اُٹھائے اور آگے بڑھا۔ وہ سامنے مسافر کی منزل ہے پہاڑی کی چڑھائی دُشوار تھی۔ نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا کہ اُس سے راستہ پوچھے۔ مگر وہ کمر بند باندھ کر اوپر چلا جا رہا تھا۔

ایک آدمی نے اوپر سے آواز دی ادھر سے کہاں آتے ہو بھائی؟ راستہ تو پچھم کی طرف سے ہے۔ کہیں پاؤں پھسل جائے تو دو سو ہاتھ نیچے جاؤ۔

لیکن شنکھدھر کو اِن باتوں کے سُننے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ اتنی تیزی سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ کہ اس آدمی کو حیرت ہوئی۔ اس نے سمجھا ضرور کوئی اجنبی آدمی ہے۔ شنکھدھر اوپر پہونچ گیا۔ تو اُس نے کہا دیکھنے میں تو ایک ہڈی کے آدمی ہو۔ پر ہو ہمت۔ کہاں گھر ہے؟

شنکھدھر نے دم لیکر کہا۔ بابا بھگوان داس ابھی یہاں ہیں؟

کسان کون بابا بھگوان داس یہاں تو کبھی نہیں آئے۔ تم کہاں سے آئے ہو۔

شنکھدھر۔ بابا بھگوان کو نہیں جانتے۔ وہ اسی گاؤں میں تو آئے ہیں سائیں گنج یہی ہے نا؟

کسان۔ سائیں گنج۔ ارے رے سائیں گنج تو تم پورب چھوڑ آئے۔ اس گاؤں کا نام تو میندو ہے۔

شنکھ دھر نے مایوس ہوکر کہا کہ سائیں گنج یہاں سے کتنی دور ہے؟

کسان۔ سائیں گنج پڑے گا یہاں سے پانچ کوس۔ مگر راستہ بیہڑ ہے۔

شنکھ دھر کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ پانچ کوس کی منزل۔ اس پر راستہ بیہڑ اس نے آسمان کی طرف ایک بار حسرت میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اگر اس مرتبہ پر ان کے درشن نہ ہوئے تو پھر شاید کبھی نہ ہوں۔ ساری زندگی تلاش ہی میں گذر جائے گی۔ دم لینے کا موقع نہیں۔ آج یا تو اس تپسیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یا اس زندگی کا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

کسان نے پوچھا۔ کیا چلے جاتے بھائی۔ چلو دودھ تو پی لو۔

لیکن شنکھ دھر اس کے پہلے ہی چل کھڑا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں دیکھتا۔ کچھ نہیں سنتا۔ کسی اندھی طاقت کی طرح خاموش چلا جا رہا ہے۔ بسنت کے ٹھنڈے فرحت بخش جھونکے کسی مہربان ماں کی طرح درختوں کے ہنڈولے میں جھلا رہے ہیں۔ نوزائیدہ کونپلیں اس کی گود میں بیٹھی مسکرا رہی ہیں۔ چڑیاں انہیں گا گا کر لوریاں سنا رہی ہیں۔ آفتاب کی سنہری کرنیں ان کے بوسے لے رہی ہیں۔ ساری فطرت ممتا کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ صرف ایک بدنصیب ہے جس پر اس کا کوئی اثر نہیں اور وہ شنکھ دھر ہے۔

شنکھ دھر سوچ رہا ہے۔ اب کے پھر کہیں راستہ بھولا تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اچھا انکے درشن ہو گئے تو ان کے سامنے منہ کھول سکے گا یا نہیں۔ وہ اسکے دیکھ کر ناراض تو ہونگے۔ وہ ان سے کہے گا کیا۔ وہ اسے گھر واپس جانے کی

ترغیب دینگے شاید گھر والوں کی انہیں یاد بھی نہ ہو۔ لیکن کیا اماں کی حالت زار پر انہیں مطلق رحم نہ آئے گا۔ کیا جب وہ سُنیں گے کہ ان کی اماں سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں۔ ان کے روتے روتے اندھے ہو گئے ہیں۔ ان کا شوہر سمجھے گا وہ دل جو غیروں کے درد سے لبریز ہے۔ کیا اپنوں کا درد اسے بالکل نہ ہوگا۔

انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا شنکھدھر دھاوا مارتے چلا جا رہا تھا۔ آخر دوپہر ہوتے ہوتے اسے دور سے ایک مندر کا کلس نظر آیا۔ ایک چرواہے سے پوچھا وہ کون گاؤں ہے؟ اس نے کہا سائیں گنج۔ سائیں گنج آ گیا وہ مقام جہاں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ جہاں اس بات کا فیصلہ ہونے والا تھا کہ وہ راج پاٹ کر راج کرے گا۔ یا فقیر بن کر بھیک مانگے گا۔

لیکن جوں جوں گاؤں قریب آتا تھا شنکھدھر کے پاؤں سست پڑتے جاتے تھے۔ اسے یہ اندیشہ ہونے لگا تھا۔ کہ کہیں وہ یہاں سے بھی نہ چلے گئے ہوں۔ وہ اس خیال کو کتنا ہی دل سے نکالنا چاہتا تھا۔ پر وہ اپنا آسن نہ چھوڑتا تھا۔ اچھا بالفرض ان سے یہاں ملاقات نہ ہوئی تو وہ اور آگے جا سکیگا نہیں اب اس میں ایک قدم چلنے کی بھی قوت نہیں ہے اگر ملاقات ہوگی تو یہیں ہوگی۔ ورنہ پھر کوئی امید نہیں۔ اچھا اگر ملاقات ہوتے ہی انہوں نے اسے پہچان لیا تو شاید اس کی طرف سے منہ پھیر لیں۔ تب وہ کیا کریگا کیا اس حالت میں بھی وہ ان کے قدموں کو بوسہ دے سکے گا۔ انہیں اپنا قصہ غم سُنا سکے گا ہرگز نہیں۔ تب تو اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔ آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ گرے گی۔ مگر کیا وہ اتنے بے رحم اتنے سنگدل ہو جائیں گے۔ ایسا ممکن نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے فرض کا جو اونچا معیار اپنے سامنے رکھا ہے۔ اور جس بے غرض خدمت،

کے لئے انہوں نے راج پاٹ ترک کر دیا ہے۔ وہ اُن کے جذبات کو زبان تک نہ آنے دے۔ اپنے پیارے لڑکے کو سینہ سے لگانے کے لئے بے تاب ہو کر بھی وہ چھاتی پر پتھر کی سِل رکھ کر اُس کی طرف سے منہ پھیر لیں۔ کچھ بھی ہو اتنی دُور آکر اب ان کی زیارت کئے بغیر نہ لوٹے گا۔

سائیں گنج سامنے دکھائی دینے لگا۔ کھیتوں میں زن و مرد اناج کاٹتے نظر آنے لگے۔ اب وہ گانوں کے ڈانڈوں پر پہونچ گیا۔ کئی آدمی اس کے سامنے سے ہو کر نکل بھی گئے۔ پر اُس نے کسی سے کچھ پوچھا نہیں۔ اگر کسی نے کہدیا کہ باباجی نہیں ہیں تو وہ کیا کرے گا۔ اگر یہی کہدیا کہ باباجی ہیں تب وہ کیا کرے گا۔ اس حیص بیص میں پڑا ہوا وہ اس منزل کے پاس جا کر ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ زبان پر سکوت کی مہر لگی ہوئی تھی۔

یکایک ایک آدمی کو مندر سے نکلتے دیکھ کر وہ چونک پڑا پھر اٹھا کہ اسکے پیروں پر گر پڑے۔ مگر پیر تھرا گئے معلوم ہوا کہ کوئی ندی اس کی طرف بہتی چلی آتی ہے۔ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔

یہ آدمی کون تھا؟ وہی جس کی تصویر اُس کے دل پر نقش تھی۔

(۴۴)

بدنصیب اہلیا کے لئے سنسار سُونا ہو گیا۔ شوہر کو پہلے ہی کھو چکی تھی زندگی کا سہارا ایک لڑکا تھا۔ اُسے بھی کھو بیٹھی۔ اب وہ کس کا منہ دیکھ کر جئے۔ وہ راج اُسکے لئے کسی فقیر کی بددعا ہو گئی۔ شوہر اور بیٹے کو پا کر اب وہ ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں بھی کتنے سُکھ سے رہے گی۔

اہلیا کو اب وہ قصرِ شاہی پھاڑے کھاتا تھا۔ وہ اُسے چھوڑ کر کہیں نکل

بھاگنا چاہتی تھی۔ کوئی سڑا گلا جھونپڑا کسی درخت کا سایہ، کسی پہاڑ کا غار، کسی ندی کا کنارا، کسی جنگل کا دامن، اسکے لئے اِس محل سے کہیں زیادہ سکون بخش ہوتا۔ وہ دن کتنے مبارک تھے۔ جب وہ اپنے سوامی کے ساتھ اپنے لختِ جگر کو سینہ سے لگائے ایک چھوٹے سے شکستہ حال گھر میں رہتی تھی۔ کیا وہ دن پھر نہ آویں گے! وہ منحوس گھڑی تھی۔ جب اُس نے اِس گھر میں قدم رکھا۔ آہ! جب اُس کا شوہر اُس سے رخصت ہونے لگا۔ وہ اس کے ساتھ ہی کیوں نہ چلی گئی۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ جس بیٹے کے لئے اُس نے شوہر کو چھوڑا وہ بھی اُسے چھوڑ کر چلا جائے گا۔

وہ ایوان شاہی اب بھوتوں کا ڈیرا ہوگیا ہے۔ گویا اسکا نگران نہیں رہا۔ راجہ صاحب مہینوں نہیں آتے۔ وہ بیشتر علاقہ ہی میں گھومتے رہتے ہیں اُن کے مظالم کی داستانیں سُنکر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ساری ریاست میں طوفان سا برپا ہے۔ کہیں کسی موضع میں آگ لگائی جاتی ہے، کہیں کسی گانوں کے کنوئیں ناپاک کئے جاتے ہیں۔ راجہ صاحب کو کسی پر رحم نہیں آتا۔ انکے سارے نازک احساسات سُنکھدھر کے ساتھ چلے گئے مشیت نے بے وجہ اُن پر یہ قہر ڈھایا ہے۔ جب اُن کے حال زار پر اُسے رحم نہیں آتا۔ جو رحیم اور کریم مشہور ہے۔ تو وہ کیوں کسی پر رحم کریں۔ اگر دستِ غیب نے اُن کے گھر میں آگ لگائی ہے تو وہ بھی دوسروں کے گھر میں آگ لگائیں گے۔ اگر اُس نے اُنہیں رُلایا ہے تو وہ بھی دوسروں کو رُلائینگے۔ جسکا گھر بالکل اجڑ گیا۔ اُسے کس کا خوف۔!

اب راجہ صاحب کے پاس جانے کا کسی کو حوصلہ نہیں ہوتا۔ منورما کو دیکھکر وہ جل اُٹھتے ہیں۔ اہلیا بھی انکے سامنے زبان کھولتے ہوئے تھرتھر کانپتی ہے

اپنے پیاروں کی تلاش کے لیے وہ طرح طرح کے منصوبے باندھا کرتی ہے۔ مگر کچھ کیں سے اب اُسے بار بار خیال آتا ہے کہ اگر وہ ثروت کی ہوس میں شوہر سے بے اعتنائی نہ کرتی تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ وہ سوچتی ہے۔ اگر میں اپنے گھر چلی جاؤں تو شاید الیشور میری خطا معاف کر دیں۔ اُس کا ڈوبتا ہوا دل اس تنکے کے سہارے کو زوروں سے پکڑے ہوئے ہے۔ لیکن ہائے رے نفس! اس عذاب میں بھی غرور کا جنون سر پر سوار ہے۔ جانا تو چاہتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی بلانے آئے۔ اگر راجہ صاحب منشی جی سے اشارہ کر دیں تو فوراً بلاوا آ جائے۔ لیکن راجہ صاحب سے کچھ کہنے کا یا تو موقع نہیں ملتا، یا ہمت نہیں ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اگر منورما سے یہ راز کہہ دیتی تو منشا پوری ہو جاتی لیکن منورما سے اُس کا دل نہ پہلے کبھی ملا تھا۔ نہ اب ملتا تھا۔ جو منورما اب گانے بجانے اور سیر و تفریح میں مگن رہتی ہے۔ اُس سے وہ اپنا دردِ دل کیسے کہہ سکتی ہے۔ وہ دن کے دن پڑی بسورا کرتی ہے۔ منورما کبھی بھول کر بھی اس کی بات نہیں پوچھتی۔ اپنے راگ رنگ میں بھولی ہوئی ہے۔ پرائی پیڑ کیا جانے!

مگر کیا منورما واقعی راگ رنگ میں بھولی ہوئی ہے؟ بظاہر تو صحیح ہے لیکن دل کی کون جانے۔ وہ اُمید اور یاس، سکون اور اضطراب، متانت اور شوخی، ضبط اور درد کا عجیب معمہ بن گئی ہے۔ اگر وہ دل سے ہنستی اور گاتی ہے تو اس کے حُسن کی وہ چمک کہاں ہے۔ جو چاند کو لجاتی تھی، وہ تیزی کہاں ہے جو ہرن کو ہراتی تھی۔ وہ سوزِ باطن کی اُس حد تک پہونچ گئی ہے۔ جب فکر اور آرزو، شرم اور خودداری کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اُس نے کبھی عقل میں شباب جیسا انمول رتن دے کر جو سونے کی گڑیا خریدی تھی، وہ کسی چڑیا کی طرح اس کے ہاتھوں سے اڑ گئی تھی۔ اور جس بھولی کے لیے وہ گڑیا خریدی تھی

وہ پہلے ہی روٹھ گئی تھی۔ کچھ دنوں ایلیا نے ہوس کو سہیلی بنائے گڑیا کھیلتی رہی۔ اور آج وہ گڑیا بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ قسمت کی یہ عشوہ گری رونے کی چیز نہیں۔ ہنسنے کی چیز ہے۔ ہم عارضی دردوں میں ہی روتے ہیں۔ مزمن دردوں میں ہم خوب ہنستے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہنستے ہیں۔ جتنا ہم انتہائی مسرت میں ہنستے۔ ہماری خوشی جنون کی حد تک پہونچ جاتی ہے۔ ہمارے پاس قسمت کی ستم شعاریوں کا اسکے سوا اور جواب ہی کیا ہے۔ روشنی جب ہماری قوت برداشت سے باہر ہو جاتی ہے تو وہ مبدل بہ تاریکی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہماری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

ایک دن اہلیا کا دل اتنا بیقرار ہوا کہ وہ شرم اور خودداری کو بالائے طاق رکھ کر منورما کے پاس آ بیٹھی۔ منورما کے روبرو سائل کی صورت میں آنے میں اُسے جو روحانی خلش ہوئی۔ اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اپنے کمرے سے یہاں تک آنے میں اُسے آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ کتنی ہی بار دروازہ تک آکر لوٹ گئی۔ جس سے ہمیشہ بدظن رہی۔ اسکے سامنے اپنی غرض لیکر جانے میں اس کی موت ہوئی جاتی تھی۔ لیکن جب بھگوان نے ہی اُسکے غرور کو پامال کر دیا تو اب جھوٹی اینٹھ سے کیا ہو سکتا تھا۔

منورما نے اُسے دیکھ کر پوچھا۔ کیا رو رہی تھیں اہلیا! یوں کب تک روتی رہو گی!

اہلیا نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ جب تک بھگوان رُلا دیں۔

کہنے کو تو اہلیا یہ کہہ گئی۔ مگر اس سوال سے اس کا غرور جاگ اُٹھا اور وہ پچھتائی کہ یہاں ناحق آئی۔

منورما نے بیدردی سے کہا۔ تب تو اور ہنسنا چاہیئے۔ جسمیں درد نہیں اُسکے سامنے رو کر دیدہ کیوں کھوتی ہو۔ بھگوان اپنے گھر کا بھگوان ہوگا۔ کوئی اسکے

رُلانے سے کیوں روتے ؟ ایک بار ٹھان لو کہ اب نہ روؤں گی۔ پھر دیکھوں کیسے رونا آتا ہے؟

اہلیا سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ بولی۔ تم تو جلے پر نمک چھڑکتی ہو رانی جی۔ تمہارا جیسا دل کہاں سے لاؤں؟ اور پھر روتا وہی ہے جس پر پڑتی ہے جس پر پڑی ہی نہیں وہ کیوں روئے گا۔

منورما ہنسی۔ وہ ہنسی جو یا تو دیوانہ ہی ہنس سکتا ہے، یا فرزانہ ہی۔ بولی۔ اگر بھگوان کسی کو رُلا کر ہی خوش ہوتا ہے تو وہ عجیب چیز ہے اور کوئی ماں یا باپ اپنی اولاد کو رُلا لے۔ دیکھ کر خوش ہو تو تم اُسے کیا کہو گی۔ بولو، تمہارا جی چاہے گا کہ ایسے آدمی کا منہ نہ دیکھوں۔ کیا بھگوان ہم سے اور تم سے بھی گیا گذرا ہے آؤ بیٹھ کر گائیں۔ اس سے بھگوان خوش ہوں گے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں سب کے بھلے کے لئے ہی کرتے ہیں۔ تمہیں ایک بھیرویں سناؤں گی۔ دیکھو میں کیسا اچھا گاتی ہوں۔

اہلیا نے اس کی بات کو اَن سُنی کر کے کہا۔ میں اس وقت آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں۔ مجھے ایسا گمان ہو رہا ہے کہ یہ ساری گردش میری ہوسِ ثروت کا پھل ہے۔ جب تک ثروت سے میرا گلا نہ چھوٹے گا۔ مجھے اس عذاب سے نجات نہ ہو گی۔ میرا دل کہتا ہے یہاں سے نکل کر میری مُرادیں پوری ہوں گی۔ آپ اتنی تکلیف کریں کہ اماں سے کہدیں مجھے بُلا لیں۔

منورما کو اہلیا سے آج سچی ہمدردی ہوئی۔ کون جانے اہلیا کے دل میں یہ غیبی تحریک ہو۔ اُس نے اُسی دن جا کر نرملا سے یہ ذکر کیا اور دوسرے ہی دن منشی بجر دھر نے راجہ صاحب کے پاس رخصتی کا پیغام بھیجا۔ راجہ صاحب علاقہ پر تھے۔ پیغام پاتے ہی جگدیش پور آئے۔ اہلیا کا کلیجہ دھک دھک کر رہا

تھا۔ کہ کہیں راجہ صاحب سے سامنا نہ ہو جائے۔ اِدھر اُدھر چھپتی پھرتی تھی۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ راجہ صاحب نے اس کی رخصتی منظور کر لی ہے۔ پر اب نہ جانے کیوں وہ جانے کے لئے بہت بیتاب نہ تھی۔ یہاں سے جانا تو چاہتی تھی۔ پر جاتے صدمہ ہوتا تھا۔ یہاں آئے اُسے چودہ سال ہو گئے۔ اس گھر کو وہ اپنا ہی گھر سمجھنے لگی تھی۔ سسرال کے لئے پرایا گھر تھا۔ لیکن زمانے کوئی لگتی ہوئی بات کہدی تو وہ کیا کرے گی۔ جس گھر سے روٹھ کر نکلی تھی۔ مجبور ہو کر پھر وہیں جانا پڑ رہا تھا۔ ان خیالات نے اُسے اتنا سراسیمہ کیا کہ آخر وہ راجہ صاحب کے پاس جا کر بولی۔ آپ مجھے کیوں رخصت کرتے ہیں۔ میں نہیں جانا چاہتی ؛

راجہ صاحب نے ہنسکر کہا۔ کوئی لڑکی ایسی بھی ہے جو خوشی سے سسرال جاتی ہو۔؟ اور کون باپ ایسا ہے جو لڑکی کو خوشی سے رخصت کرتا ہو۔ میں کب چاہتا ہوں۔ کہ تم جاؤ۔ لیکن منشی بجر دھر کا حکم ہے اور اس کی تعمیل مجھ پر فرض ہے۔ وہ لڑکے کے باپ ہیں، میں لڑکی کا باپ ہوں۔ میری اور اُن کی کیا برابری۔ اور بیٹی، میرے دل میں بھی ارمان ہیں، اُنہیں پورا کرنے کا اور کون موقعہ آئے گا۔ شنکھدھر ہوتا تو اس کی شادی میں یہ ارمان پورے ہوتے اب تمہارے گونے میں پورے ہونگے۔

اہلیا اس کا کیا جواب دیتی ؟

دوسرے دن سے راجہ صاحب نے رخصتی کی تیاریاں شروع کیں سارے علاقہ کے سونار پکڑ بلائے گئے۔ اور زیور بننے لگے۔ علاقہ ہی کے درزی کپڑے سینے لگے۔ گھر کی صفائی، سفیدی اور رنگائی ہونے لگی۔ راجاؤں۔ رئیسوں اور افسروں کے نام نوید بھیجے جانے لگے۔ سارے شہر کے طایفوں کو بیعانے

دیپ لگائے گئے۔ برقی روشنی کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کسی بڑی بارات کی مہمانداری کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اہلیا یہ اہتمام دیکھ کر دل میں شرماتی اور جھنجلاتی تھی۔ سوچتی کہاں سے کہاں میں نے رخصتی کا نام لیا۔ اب اس بڑھاپے میں میرا گونہ ہو رہا ہے۔ میں مرنے کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ یہاں رخصتی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کون جانے شاید یہ آخری رخصتی ہی ہو۔ راجہ صاحب انتظام میں ایسے منہمک تھے۔ کہ کسی سے بات کرنے کی بھی انہیں فرصت نہ تھی۔ کہیں سناروں کے پاس بیٹھے اچھی نقاشی کرنے کی تاکید کر رہے ہیں۔ کہیں درزیوں کے پاس بیٹھے مہین بخئے پر زور دے رہے ہیں۔ کہیں جوہریوں کے یہاں بیٹھے جواہرات پرکھ رہے ہیں۔ ان کے ارمانوں کا وارا پار نہ تھا۔ من کی مٹھائی گھی شکر کی مٹھائی سے کم لذیذ نہیں ہوتی۔

(۴۵)

شنکھدھر کو ہوش آیا تو اس نے اپنے کو مندر کے برآمدے میں چکردھر کی گود میں پڑا پایا۔ چکردھر تشویشناک نگاہوں سے اس کے چہرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ گاؤں کے کئی آدمی آس پاس کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ آہ! آج کتنے دنوں کے بعد شنکھدھر کو یہ نعمت ملی ہے۔ وہ باپ کی گود میں لیٹا ہوا ہے۔ آسمان کے بسنے والو! تم پھولوں کی برکھا کیوں نہیں کرتے۔

شنکھدھر نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی جانِ حزیں اس وقت ایک روحانی طراوت، ایک پُرکیف سرور اور وجدانی سکون کا احساس کر رہی تھی۔ اس پُرخلش مزے کو وہ اتنی جلد نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی حرماں نصیب ماں کی یاد آئی۔ اس مبارک دن کا خواب دیکھنے لگا۔ جب وہ اپنی ماں کو بھی باپ کے

درشن کرائے گا۔ اُس کی نامراد زندگی کو اِس مسرت سے ہم آغوش کرے گا۔

چکردھر نے پیار کی مِٹھاس میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا۔ کیوں بیٹا۔ اب طبیعت کیسی ہے؟

شنکھدھر اُلجھن میں پڑا۔ کیا جواب دے؟ اگر کہتا ہے اچھا ہوں تو اِس لغزت عظلے سے محروم ہوتا ہے۔ اُس نے خاموش رہنا ہی مصلحت سمجھی۔ کچھ جواب دینا بھی چاہتا تو اسکے منہ سے الفاظ نہ نکلتے۔ اُس کا جی چاہتا تھا اِن قدموں پر سر رکھکر خوب روئے۔ اِس سے بڑی مسرت کا وہ قیاس ہی نہ کر سکتا تھا۔ دُنیا کی کوئی چیز کبھی اتنی خوش آیند تھی۔؟ ہوا اور روشنی درخت اور جنگل زمین اور آسمان کبھی اتنے دلکش نہ تھے۔ ان کی کیفیت کچھ اور ہوگئی تھی۔ انہیں کتنی کشش تھی۔ کتنی وجدانیت۔

چکردھر نے پھر پوچھا۔ کیوں بیٹا کیسی طبیعت ہے؟

شنکھدھر نے دبی ہوئی زبان سے کہا۔ اب تو اچھا ہوں۔ ایک لمحہ کے بعد وہ پھر بولا۔ آپ کے درشنوں کے لئے ترستا دا رہے آ رہا ہوں۔ میں نے بیدول میں آپ کی خبر پائی تھی۔ وہاں معلوم ہوا کہ آپ سائیں گنج چلے گئے۔ وہاں سے سائیں گنج چلا۔ ساری رات چلتے گزر گئی۔ مگر سائیں گنج نہ ملا۔ ایک دوسرے گانو میں جا پہنچا۔

چکردھر۔ رات کو کہیں ٹھیرے نہیں؟

شنکھدھر۔ یہی خوف تھا کہ شاید آپ کہیں اور نہ چلے جائیں۔

چکردھر۔ کچھ کھایا بھی نہ ہوگا۔

شنکھدھر۔ کھانے کی تو نہ یاد خواہش نہ تھی۔ آپ کے درشن ہو گئے میری مُراد پوری ہو گئی۔ ساری مصیبتیں کٹ جائیں گی۔

چکردھر نے شفقت آمیز لہجہ میں کہا۔ بیٹا مصیبتوں کا کاٹنے والا ایشور ہے میں اُس کا ایک ناچیز سیوک ہوں۔ لیکن پہلے کچھ کھا کر آرام سے سو رہو۔ مجھے کئی مریضوں کو دیکھنے جانا ہے۔ میں شام کو لوٹوں گا۔ تو تم سے باتیں ہونگی میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف ہوئی۔ اِس کا افسوس ہے۔

شنکھدھر نے عقیدت مندانہ لہجہ میں کہا۔ مجھے تو یہ سُرگ یاترا سی معلوم ہوتی تھی۔ بھوک پیاس وتکان ایک کا نام بھی نہ تھا۔

چکردھر کو اپنی طبیعت پر قابو نہ رہا۔ اِس نوجوان کے بشرے اور انداز گفتگو میں نہ جانے ایسی کونسی بات تھی۔ جو اُنہیں اپنی جانب مائل کر رہی تھی۔ ان کے دل میں اسکی داستان سُننے کا بے تاب کن اشتیاق پیدا ہوا مریضوں کو دیکھنے جانا چاہتے تھے۔ مگر نفس بہانے ڈھونڈنے لگا" مریضوں کو دوا تو دے ہی آیا ہوں۔ ان کی حالت بھی کچھ زیادہ تشویشناک نہیں۔ جانا فضول ہے۔ ذرا پوچھنا چاہیئے۔ یہ کون ہے؟ کیوں مجھ سے ملنے کے لیئے اتنا بے قرار تھا۔ کتنا ذی شعور لڑکا ہے۔ انداز گفتگو میں کتنا انکسار بھرا ہوا ہے۔ کسی اچھے خاندان کا چراغ ہے۔

لیکن پھر سوچا۔ میرے نہ جانے سے مریضوں کو کتنی مایوسی ہوگی۔ کون جانے ان کی حالت خراب ہو گئی ہو۔ تب تک یہ لڑکا بھی آرام کرے گا۔ بیچارہ ساری رات چلتا رہا۔ میں جانتا تو بیدوں ہی میں ٹاک گیا ہوتا۔

ایک آدمی پانی لایا۔ شنکھدھر نے منہ ہاتھ دھویا اور لوٹے کو منہ سے لگا کر پانی پینا چاہتا تھا کہ چکردھر بول اُٹھے۔ ہاں، ہاں، یہ کیا! ابھی پانی نہ پیو رات کو کچھ کھایا نہیں اور باسی منہ پانی پینے لگے۔

شنکھدھر۔ بڑی پیاس لگی ہے۔

چکردھر۔ پانی کہیں بھاگا تو نہیں جاتا۔ کچھ کھا کر پیو۔
شنکھدھر۔ دو ہی گھونٹ پی لوں۔ نہیں رہا جاتا۔
چکردھر نے اس کے ہاتھ سے لوٹا چھین لیا اور سخت ہو کر بولے۔ ابھی تم ایک قطرہ پانی نہیں پی سکتے۔ منع کرتا ہوں تو مانتے نہیں۔
شنکھدھر کو اس تنبیہ میں جو مزہ آیا وہ ماں کی لاڈ پیار کی باتوں میں بھی نہ آیا پانچ سال ہوئے جب سے وہ اپنے من کی کرتا آیا ہے۔ وہ جو پاتا ہے کھاتا ہے جب چاہتا ہے پانی پیتا ہے: جہاں جگہ پاتا ہے۔ پڑ رہتا ہے کسی کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی۔ لوٹا ہاتھ سے نہ چھین گیا ہوتا تو وہ بغیر دو چار گھونٹوں کا مزہ لئے نہ رہتا ؛
مندر کے پیچھے ایک چھوٹا سا باغ اور کنواں تھا۔ وہیں ایک درخت کے نیچے چکردھر کا کھانا پکتا تھا۔ چکردھر اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ برتن بھی آپ ہی دھوتے تھے۔ شنکھدھر ان کے ساتھ کھانا کھانے گیا تو دیکھا تھالی میں پوری۔ مٹھائی۔ دودھ۔ دہی۔ گھی سب کچھ ہے۔ اس کی رال ٹپکنے لگی، ان نعمتوں کے مزہ چکھے ہوئے اسے ایک مدت گذر گئی۔ مگر اسے کتنی حیرت ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ ساری چیزیں اسی کے لئے مخصوص ہیں۔ چکردھر خود روکھی روٹیاں اور بھاجی لے کر بیٹھے۔
شنکھدھر نے کہا۔ آپ تو سب کچھ مجھی کو دیئے دیتے ہیں۔ اپنے لئے کچھ رکھا ہی نہیں۔
چکردھر۔ میرے لئے یہ روٹیاں کافی ہیں۔ یہی میری خوراک ہے۔
شنکھدھر۔ تو مجھے بھی روٹیاں ہی دیجئے۔
چکردھر۔ بیٹا میں تو روٹیوں کے سوا اور کچھ نہیں کھاتا میرا معدہ کمزور ہے

دن میں صرف ایک بار کھاتا ہوں۔

شنکھ دھر۔ میری خوراک تو تھوڑا سا ستو یا چبینا ہے میں نے تو مدت سے نعمتیں نہیں کھائیں۔ اگر آپ نہ کھائیں گے تو میں بھی نہ کھاؤں گا۔

آخر شنکھ دھر کے اصرار سے چکر دھر کو اپنا اصول توڑنا پڑا۔ سولہ برسوں کا پالا ہوا اصول جسے بڑے بڑے رئیسوں اور راجاؤں کا پُر عقیدت اصرار بھی نہ توڑ سکا تھا۔ آج اس اجنبی لڑکے کے ہاتھوں ٹوٹ گیا۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔ تم تو بڑے ضدی معلوم ہوتے ہو۔ اچھا لو میں بھی لئے لیتا ہوں اب تو کھاؤ گے؟

انہوں نے تھالی کی ہر ایک چیز میں ذرا ذرا سا نکال کر اپنے پتل میں رکھ لیا۔

شنکھ دھر۔ آپ نے تو محض رسم کی پابندی کی ہے۔ لائیے میں پروس دوں۔

چکر دھر۔ اگر تم اس طرح ضد کرو گے۔ تو میں تمہیں اپنے ساتھ نہ رکھوں گا۔

شنکھ دھر۔ مجھے کیا! یہیں پڑے پڑے مر جاؤں گا۔ کون کوئی رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔

یہ کہتے کہتے شنکھ دھر کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ شنکھ دھر نے مجبور ہو کر کہا اچھا لاؤ تمہیں اپنے ہاتھ سے دے دوں بھائی! اپنے کو کوستے کیوں ہو۔

شنکھ دھر نے سبھی چیزیں دست آدھی سے زیادہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں اور آپ ایک پنکھا لے کر انہیں جھلنے لگا۔ چکر دھر نے ملائمت آمیز ترشی سے کہا۔ معلوم ہوتا ہے آج تم مجھے بیمار کرو گے۔ بھلا اتنی چیزیں میں کھا سکوں گا۔

شنکھدھر۔ آپ جو کچھ چھوڑ دیں گے۔ وہ میں کھاؤں گا۔ مجھے آپ کا جوٹھا کھانے کی بڑی خواہش ہے۔

اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ چکردھر نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ میرا جوٹھا کیوں کھاؤ گے؟ اب تو ساری باتیں تمہاری مرضی کے مطابق ہو رہی ہیں۔

شنکھدھر۔ مجھے تین دنوں سے یہ آرزو ہے۔ ایک مدت سے یہ موقع ڈھونڈھ رہا تھا۔

چکردھر کو پھر ہار ماننی پڑی۔ وہ گوشہ عافیت میں بیٹھنے والا نفس کش زاہد پرور عامل آج ایک اجنبی بے کس لڑکے کے احمقانہ اصرار کو کسی طرح نہ ٹال سکتا تھا۔

چکردھر جب کھانا کھا کر اُٹھ گئے۔ تو وہ کھانے بیٹھا۔ آہ! اس کھانے میں آج کتنی لذت تھی۔ گھر پر تکلف سے پکے ہوئے پکوانوں میں بھی یہ لذت نہ تھی۔

چکردھر ہاتھ منہ دھو کر رقت آمیز لہجہ میں بولے۔ تم نے آج میرے دو اصول توڑ دیئے۔ بغیر جانے بوجھے کسی کو مہمان بنانے کا یہی نتیجہ ہے۔ اب میں آج کہیں نہ جاؤں گا۔ تم کھانا کھا لو اور مجھ سے جو کچھ کہنا ہو کہو۔ میں ایسے ضدی لڑکے کو اپنے ساتھ نہ رکھوں گا۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟

شنکھدھر۔ میرے تو کوئی گھر ہی نہیں۔

چکردھر۔ ماں باپ تو ہوں گے! وہ کس گاؤں میں رہتے ہیں۔

شنکھدھر۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میرے والد تو بچپن ہی میں گھر سے نکل گئے اور والدہ کی پانچ سال سے مجھے خبر نہیں۔

چکردھر کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا زمین نیچے دھنسی جا رہی ہے۔ گویا وہ لہروں

میں بہے جا رہے ہیں۔ بابا بچپن سے گھر میں چلے گئے۔ اور ماں کی پانچ سال سے کچھ خبر نہیں ملی۔ بھگوان کیا یہ وہی ننھا سا لڑکا ہے وہی جسے دل سے نکال ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے سولہ سال سے زیادہ ہو گئے۔

انہوں نے دل کو سنبھالتے ہوئے پوچھا "تم پانچ سال تک کہاں رہے جو پھر نہیں گئے"

ششنکھدھر "ابا جان کی تلاش میں نکلا تھا۔ اور جب تک وہ نہ ملیں گے لوٹ کر نہ جاؤں گا۔"

چکردھر کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سائبان کے ستون کے سہارے بیٹھ گئے۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے "تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟"

یہ سوال نہ تھا۔ ایک معلوم حقیقت کی تصدیق تھی۔ اس سوال کا جواب کیا وہی ہوگا جس کا امکان چکردھر کو امید و بیم کی حالت میں ڈالے ہوئے تھا۔ دنیا میں کیا ایسا ایک ہی لڑکا ہے جسے اس کا باپ بچپن میں چھوڑ کر چلا گیا ہو۔ کیا ایسا ایک ہی لڑکا ہے۔ جو اپنے باپ کی تلاش میں نکلا ہو؟

ششنکھدھر نے اپنا نام بتا دیا۔

"اور تمہارے باپ کا کیا نام ہے"

ششنکھدھر نے باپ کا نام بھی بتا دیا۔

"مکان کہاں ہے"

"جگدیش پور"

چکردھر کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کے بدن سے جان نکل گئی ہے اور چاروں طرف خلا ہے۔ ششنکھدھر! بس یہی ایک لفظ اس فضائے بیکراں میں کسی چڑیا کی طرح چکر لگا رہا ہے۔ ششنکھدھر! ایک یاد تھی جو اس بیہوشی کی حالت میں بھی

اندرا کو تعلقات سے باندھے ہوئی تھی۔

(۴۶)

راجہ بشال سنگھ نے جس اہتمام سے اہلیا کی رخصتی کی وہ راجاؤں رئیسوں میں بھی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ تحصیلدار صاحب کے گھر میں ان چیزوں کے رکھنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ باوجودیکہ تحصیلدار صاحب نے نیا مکان بنوایا تھا مگر وہ کیا جانتے تھے۔ کہ ایک دن ریاست جگدیش پور کی آدھی ثروت آپہنچے گی۔ گھر کا کونہ کونہ سامان سے بھرا ہوا تھا۔ کئی پڑوسیوں کے مکان بھی انٹ اُٹھے اس پر لاکھوں روپے نقد ملے۔ وہ الگ۔ منشی جی لانے کو تو سب کچھ لائے پر اب اسے دیکھ دیکھ کر روتے اور کڑھتے تھے۔ کوئی بھوگنے والا نہیں۔ اگر یہی دولت آج سے پچیس سال پہلے ملی ہوتی تو دل کھول کر زندگی کے مزے اٹھاتے۔ اب ضعیفی میں لے کر کیا کریں۔ چیزوں کو بیچنا باعثِ ذلت تھا۔ ہاں احباب کی نذر جو کچھ کر سکتے تھے وہ کیا۔ اناج کی کئی گاڑیاں ملی تھیں یہ سب لٹا دیں۔ کئی مہینے سدا برت سا چلتا رہا۔ ملازموں کو حکم دے دیا۔ کہ کسی آدمی کو کوئی چیز مانگے دینے سے انکار نہ کرو۔ سہالگ کے دنوں میں روز ہی مانگ تھی۔ گھوڑے۔ پالکیاں۔ فرش فروش وغیرہ آلات مانگے جاتے۔ سارے شہر میں منشی جی کا شہرہ ہو گیا۔ بڑے بڑے رئیس ان سے ملاقات کرنے آنے لگے یضیب جاگے تو یوں جاگے۔ روٹیاں بھی میسر نہ ہوتی تھیں۔ آج دروازے پر ہاتھی جھومتا ہے۔ سارے شہر میں یہی چرچے تھے۔

مگر منشی جی کے دل پر جو گذر رہی تھی۔ وہ کون جان سکتا ہے۔ دل میں بیسیوں ہی بار جگر دھر پر بگڑتے تے۔ نالایق آپ آپ گیا۔ اپنے ساتھ لڑکے کو بھی

لے گیا۔ بتاؤ یہ ہاتھی گھوڑے اور موٹروں اور گاڑیوں کو لیکر کیا کروں۔؟ اکیلے کس کس پر بیٹھوں۔ بہو بیٹے اسے اُن سے فرصت نہیں۔ مال ہے زندہ در گور۔ پہلے بچاہت شام سویرے کچھ گا بجا لیتے تھے۔ کچھ سرود بھی جما لیتے تھے۔ اب اِن چیزوں کی دیکھ بھال ہی میں بُھور ہو جاتا۔ لمحہ بھر بھی آرام لینے کی مہلت نہ تھی۔

اہلیا یہاں آکر اور بھی پچھتانے لگی۔ وہ رنواس کی تکلفات سے آزردہ خاطر ہوکر یہاں آئی تھی۔ پر وہ مصیبت یہاں بھی اُسکے ساتھ آئی۔ وہاں اُسے خانہ داری سے کوئی مطلب نہ تھا۔ یہاں وہ بلا بھی سر پر آئی۔ جن چیزوں سے وہاں اُسے ذرا بھی محبت نہ تھی۔ اُنہیں کے تلف ہو جانے کی خبر سُنکر اُسے رنج ہوتا تھا۔ وہاں وہ کچھ دیر اطمینان سے بیٹھ سکتی تھی۔ کچھ دیر ہنس بول کر دل بہلا لیتی تھی۔ کسی کے طعنے تشنے نہ سُننے پڑتے تھے۔ یہاں ایک لمحہ کے لئے بھی سکون نہ تھا۔ نرملا اس کے زخم پر نمک چھڑکتی رہتی تھی۔ بہو کے کارن وہ اپنے بیٹے سے محروم ہوئی۔ بہو ہی کے کارن پوتا بھی ہاتھ سے گیا۔ ایسی سبز قدم بہو کو وہ اپنے گھر کی دیوی نہ سمجھ سکتی تھی۔ اس کی دولت لیکر وہ کیا کرے۔ بیٹے اور پوتے کے مقابلے میں اس دولت کی کیا ہستی تھی۔ کھانا بھی وہ اپنے ہاتھوں ہی پکاتی۔ اہلیا کے ساتھ جو مہراجنیں آئی تھیں۔ ان کا پکایا ہوا کھانا اس کے لئے چھوت تھا۔ ان دنوں منگلا بھی آئی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ یہاں کی ساری چیزیں سمیٹ لے جاؤں۔ اہلیا اپنی چیزوں کا لُٹنا نہ دیکھ سکتی تھی اسلئے نند بھوج میں کبھی کبھی بدمزگی ہو جاتی تھی۔

برتنوں میں کئی بڑے بڑے کنڈال بھی تھے۔ ایک کنڈال اتنا بڑا تھا۔ کہ اس میں ڈھائی سو کلسے پانی آجاتا تھا۔ اہلیا ایک دن کسی ضرورت سے اُسے تلاش کرنے لگی۔ تو اس کا پتہ نہ تھا۔ ساس سے پوچھا۔ اس نے بے دلی سے جواب دیا

میں نہیں جانتی ہوں۔ گھر میں ہے تو کہاں جا سکتا ہے۔

اہلیا: "جب گھر میں ہو نہ؟"

نرملا: "گھر میں سے کہاں غائب ہو گیا؟"

اہلیا۔ گھر کی چیز گھر کے آدمیوں کے سوا کون لے جا سکتا ہے؟

نرملا۔ تو کیا اس گھر میں سب چور ہی بستے ہیں؟

اہلیا۔ یہ تو میں نہیں کہتی۔ لیکن چیز کا پتہ تو لگنا چاہیئے۔

نرملا۔ تمہیں چیزوں سے بہت محبت ہے۔ تمہیں ان کا پتہ لگاتی پھرو۔ مجھے تو ان چیزوں کو دیکھ کر آنکھیں پھوٹتی ہیں۔

جب گھر میں کوئی کسی چیز کی حفاظت کرنے والا نہ رہا۔ تو چاروں طرف لوٹ مچ گئی۔ کچھ پتہ نہ چلتا کہ گھر میں کون لٹیرا آ بیٹھا ہے۔ لیکن چیزیں ایک ایک کر کے غائب ہوتی جاتی تھیں۔ اہلیا دیکھ کر ان دیکھی اور سن کر ان سنی کر جاتی تھی۔ پر اپنی چیزوں کو نہس نہس دیکھ کر اسے صدمہ ہوتا تھا۔ اس کا ترک ہوس پرستی کا دوسرا روپ تھا۔

اس طرح کئی مہینے گذر گئے اور اہلیا کا چراغ دن بدن مدھم ہوتا گیا۔ وہ کتنا ہی چاہتی تھی کہ خواہشوں کی بندش سے اپنے کو چھڑا لوں۔ پر دل پر کوئی قابو نہ چلتا تھا۔ کیا بھکھارنی بن کر زندگی کے دن کاٹے گی۔ دولت کے ہاتھ سے نکل جانے پر اس کے لئے پھر کونسا ذریعہ باقی رہ جائے گا۔

اہلیا بار بار عہد کرتی۔ کہ اب اپنے سارے کام اپنے ہاتھوں کروں گی۔ ایک ہی وقت کھانا کھاؤں گی۔ لیکن وہ کسی عہد پر قائم نہ رہ سکتی۔ اس میں اصول پروری کی صلاحیت باقی نہ تھی۔ صاف تجربہ ہو گیا کہ یہاں رہ کر کچھ نہ کر سکیں گی۔ لیکن اب کہاں جائے۔ جب تک خواہشوں سے گلا نہ چھوٹے۔ پیر بیٹھا ترا

اُسے نمائش سی معلوم ہوتی تھی۔

اب اُسے باگیشری کی یاد آئی۔ سکھ کے دن وہی تھے۔ جو اُس کے ساتھ کٹے۔ اصلی میکا نہ ہونے پر بھی زندگی کا جو کچھ مزہ وہاں ملا وہ پھر نہ نصیب ہوا آہ! وہ دِن خواب ہو گئے۔ ساس ملی وہ اِس طرح کی۔ نند ملی وہ اِس قماش کی ماں تھی ہی نہیں۔ صرف ایک باپ ملے مگر کتنا مہنگا سودا تھا جس دِن معلوم ہوا تھا۔ کہ وہ راجہ کی بیٹی ہے۔ وہ پھولی نہ سماتی تھی۔ پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ پر کیا معلوم تھا کہ اُس عارضی مسرت کے بدلے ساری زندگی رو کے کٹے گی۔

اب اہلیا کو شب و روز یہی دُھن رہتی تھی کہ کسی طرح باگیسری کے پاس پہنچوں۔ گویا وہاں جاتے ہی اُسکے سارے دُکھ دُور ہو جائیں گے۔ اِدھر کئی مہینوں سے کوئی خط نہ آیا تھا۔ اہلیا نے کئی بار بلایا بھی تھا۔ مگر باگیسری نے لکھا تھا۔ میں بہت آرام سے ہوں۔ مجھے یہاں پڑی رہنے دو۔ اہلیا کو باگیسری ہی سے سچی ہمدردی کی توقع تھی۔

آخر ایک دن اہلیا نے نرملا سے یہ چرچا کر ہی دیا۔ نرملا نے کچھ بھی اعتراض نہ کیا۔ شاید وہ خوش ہوئی کہ یہ کسی طرح یہاں سے ٹلے۔

اہلیا جب سفر کی طیاریاں کرنے لگی۔ تو منگلا نے ظاہرداری کی۔ "بھابی تم چلی جاؤ گی تو یہاں بالکل اچھا نہ لگے گا۔ وہاں کب تک رہنے کا ارادہ ہے!

اہلیا۔ ابھی کیا کہوں بہن یہ تو وہاں جانے پر ہی معلوم ہو گا۔

منگلا۔ اِتنے دنوں کے بعد جا رہی ہو۔ تو دو تین مہینے تو رہنا ہی پڑے گا۔ اب میں بھی چلی جاؤں گی۔ اب تو رانی منورما سے بھی ملاقات نہیں ہوتی۔ اکیلے کیسے رہا جائے گا۔؟ تمہیں لوگوں سے تو ملنے آئی تھی۔ رانی صاحب نے تو

بجھا ہی دیا۔ تم بھی چھوڑ کر چلی جاتی ہو۔

یہ کہہ کر منگلا رونے لگی۔

دوسرے دن اہلیا یہاں سے چلی۔ اپنے ساتھ کوئی سازوسامان نہ لیا۔ صرف ایک بڈھے کہار کو پہونچانے کے لئے لے لیا اور اسے بھی آگرے پہنچنے کے دوسرے ہی دن رخصت کر دیا۔

آج بیس سال کے بعد اس گھر میں پھر قدم رکھے۔ سارا گھر منہدم ہو گیا تھا نہ آنگن کا پتہ تھا نہ دیوان خانے کا۔ چاروں طرف ملبے کا ڈھیر جمع ہو رہا تھا اس پر مدار اور دھتورے کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بچی رہی تھی۔ باگیشری اُسی میں رہتی تھی۔ اُس کی صورت بھی اسی گھر کی طرح تبدیل ہو گئی تھی۔ نہ منہ میں دانت نہ آنکھوں میں بصارت۔ کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں۔ جب آنسو تھمے تو باگیشری نے کہا بیٹی تم اپنے ساتھ کچھ سامان نہیں لائیں؟ کیا دوسری گاڑی لوٹ جانے کا ارادہ ہے۔؟ اتنے دنوں کے بعد آئیں بھی تو اس طرح۔ ہاں اس کھنڈر میں تمہارا جی کیوں لگے گا!"

اہلیا۔ اماں محلوں سے بہت بیزار ہو گئی۔ اب کچھ دن اس کھنڈر ہی میں رہونگی۔ اور تمہاری خدمت کروں گی۔ جب سے یہاں سے گئی۔ ایک دن بھی سُکھ نہیں پایا۔

باگیشری۔ لڑکے کا کچھ پتہ چلا۔!

اہلیا۔ کسی کا پتہ نہیں چلا اماں؟ میں راج کے سکھوں پر لٹو ہو گئی تھی۔ اسکا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔ ان تکلیفات سے جو کچھ ملنا ہے وہ دیکھ چکی۔ اب اُنہیں چھوڑ کر دیکھوں گی۔ کیا جاتا ہے۔ مگر انہیں تو بڑی تکلیف ہو رہی ہے

اماں؟

باگیشری: کیسی تکلیف بیٹی! جب تک تمہارے دادا جیتے رہے انکی خدمت کرنے میں بھی مجھے عیش راحت تھی۔ تیرتھ، برت، پن، دھرم سب کچھ انکی خدمت ہی تھا۔ اب وہ نہیں ہیں تو انکے نام کی خدمت کر رہی ہوں۔ آج بھی ان کے کتنے ہی دوست میری مدد کو طیار ہیں۔ لیکن کیوں کسی کی مدد لوں تمہارے دادا ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے تھے۔ تو پھر میں کس منہ سے مدد کے لیے ہاتھ پھیلاؤں۔

یہ کہتے کہتے اس دیوی کا زرد چہرہ غرور سے چمک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک رقت آمیز زندہ دلی نمودار ہو گئی۔ اہلیا کا سر شرم سے جھک گیا۔

باگیشری نے پھر کہا: خواجہ محمود نے بہت چاہا۔ کہ میں اُن سے کوئی رقم ماہوار لیا کروں۔ میکے والے بھی کئی بار مجھے بلانے آئے۔ میں نے کسی کا احسان نہیں لیا۔ شوہر کی کمائی کو چھوڑ کر اور کسی کی کمائی پر عورت کا اختیار نہیں ہوتا۔ جب تک آنکھیں تھیں سلائی کرتی رہی۔ جب سے آنکھیں گئیں دلائی کرتا ہوں۔ کبھی کبھی اُن پر جی جھنجلا اٹھتا ہے۔ جو کچھ کمایا اڑا دیا۔ لیکن پھر دل کو سمجھاتی ہوں کہ اُنہوں نے کسی بُرے کام میں تو نہیں اڑایا۔ جو کچھ کیا اپنے بھائیوں کی بھلائی ہی کے لیے تو کیا۔ یہاں تک کہ اپنی جان بھی لٹا دی پھر میں کیوں پچھتاؤں۔ اور کیوں روؤں۔ چلو ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ کچھ کھا پی لو۔ تو پھر باتیں کریں گے۔

لیکن اہلیا ہاتھ منہ دھونے نہ اٹھی۔ باگیشری کی وہ عصمت پروری دیکھ کر اُس کا نفس اس پر ہنس رہا تھا۔ ایک یہ ہیں کہ شوہر کے نام پر اپنے کو مٹائے دیتی ہیں۔ ایک تو ہے کہ ثروت دیکھ کر اندھی ہو گئی۔

باگیشری نے پھر کہا۔ ابھی تک تو بیٹھی ہے۔ ہاں لونڈی پانی نہیں لائی کیسے اُٹھے گی۔ لے میں پانی لائے دیتی ہوں۔ ہاتھ منہ دھو ڈال۔ تب تک میں تیرے لئے گرم روٹیاں سینکتی ہوں۔

اہلیا یہ اخلاص میں ڈوبے ہوئے الفاظ سُن کر باغ باغ ہو گئی۔ اِس "تو" میں جو مزہ تھا۔ وہ "آپ" و "سرکار" میں کہاں! بچپن کے دن آنکھوں میں پھر گئے۔ بولی "ابھی تو بھوک پیاس نہیں ہے۔ اماں جی بیٹھئے۔ کچھ باتیں کیجئے۔ میں آپ سے اپنی مصیبت کی داستان کہنے کے لئے بے قرار ہو رہی تھی۔ بتایئے میرا بیڑا کیسے پار لگے گا۔

باگیشری نے بزرگانہ متانت سے کہا "جس کے لئے تو نے شوہر و بیٹے کو کھویا۔ اسے چھوڑ کر ہی تو اپنے پیاروں کو پا سکے گی۔ تجھے اتنی ہوس کیسے ہو گئی یہ میری سمجھ میں نہیں آتا ؟"

اہلیا "اماں! سچ کہتی ہو میں محض شنکھدھر کا خیال کر کے ان کیساتھ نہ گئی۔"

باگیشری "اِس خیال میں کیا تیری نفس پرستی پوشیدہ نہ تھی۔ تو اِس سے انکار نہیں کر سکتی۔"

اہلیا نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ہو سکتا ہے۔ اماں جی۔ ایسا ہی ہو!"

باگیشری "وہ ہوس یہاں بھی تجھے نہ چھوڑے گی۔"

اہلیا "اب تو اِس سے طبیعت سیر ہو گئی۔"

باگیشری۔ جبھی تو وہ پھر تیرا پیچھا کرے گی۔ جو اس سے بھاگتا ہے اُسی کے پیچھے وہ دوڑتی ہے۔ ایک بار چوکی تو چودہ برس رونا پڑا۔ اب کے چوکی تو باقی عمر روتے ہی گذر جائے گی ؛

(۴۷)

شنکھدھر کو اپنے باپ کے ساتھ رہتے ایک مہینہ ہو گیا۔ نہ وہ جانے کا نام لیتا ہے۔ نہ چکردھر جانے کو کہتے ہیں۔ شنکھدھر اتنا خوش و خرم رہتا ہے۔ گویا اُسے کسی چیز کی آرزو نہیں ہے۔ اتنے ہی دنوں میں اسکے مردانہ چہرے پر سُرخی نظر آنے لگی ہے۔ اور جسم بھر آیا ہے۔

چکردھر کو اب اپنے ہاتھوں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا ہے۔ وہ جب ایک گانوں سے دوسرے گانوں جاتے ہیں تو ان کا سامان شنکھدھر اٹھا لیتا۔ انہیں اپنا کھانا بھی طیار ملتا ہے۔ برتن منجے ہوئے صاف ستھرے۔ دونوں آدمیوں کی زندگی کا سب سے مسرت بخش موقع وہ ہوتا ہے۔ جب ایک سوال کرتا ہے۔ دوسرا جواب دیتا ہے۔ شنکھدھر کو اگر باباجی کی باتوں سے سیری نہیں ہوتی تو کم سخن باباجی کو بھی اس سے باتیں کرنے میں سیری نہیں ہوتی۔ وہ اپنی زندگی کے سارے تجربات، سائینس، مذہب، تاریخ، اور دیگر علوم کی ساری باتیں گھول کر پلا دینا چاہتے تھے۔ جڑی بوٹیوں کا جو علم انہوں نے بڑے بڑے باکمال فقیروں سے برسوں میں حاصل کیا تھا۔ وہ سب شنکھدھر کو سکھا دیا۔ وہ اُسے کوئی نئی بات سمجھا دینے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس کی ایک ایک حرکت پر ان کی باریک نگاہیں پڑتی رہتی ہیں۔ دوسروں سے اُس کی شرافت اور تحمل کی تعریف سُنکر ان میں کتنی مسرت ہوتی ہے۔ یہ حقیقت اب کسی سے بھی پوشیدہ نہیں کہ شنکھدھر اُن کا لڑکا ہے۔ صورت کی مشابہت اس خیال کی تصدیق کرتی ہے۔ مگر جو بات سب جانتے ہیں۔ اُسے وہ خود نہیں جانتے اور نہ جاننا چاہتے ہیں۔

ایک دن وہ ایک گاؤں میں پہونچے۔ تو وہاں دنگل ہو رہا تھا۔ شنکھدھر بھی اکھاڑے کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ ایک پٹھے نے شنکھدھر کو للکارا۔ وہ شنکھدھر سے ڈیوڑھا تھا۔ مگر شنکھدھر نے کشتی منظور کر لی۔ چکردھر یہی کہتے رہے۔ یہ لڑکا لڑنا کیا جانے! بھلا یہ کیا لڑے گا۔ لیکن شنکھدھر لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اتر ہی تو پڑا۔ اس وقت چکردھر کی صورت دیکھنے ہی کے قابل تھی۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا۔ اپنے اضطراب کو چھپانے کے لئے اکھاڑے سے دور جا بیٹھے تھے۔ گویا انہیں اس بات کی بالکل پرواہ نہیں ہے کہ اکھاڑے میں کیا ہو رہا ہے۔ بھلا لڑکوں کے کھیل سے سادھو مہاتماؤں کو کیا تعلق۔؟ لیکن کسی نہ کسی بہانے سے اکھاڑے کی طرف آ ہی جاتے تھے۔ جب اس پٹھے نے پہلی ہی پکڑ میں شنکھدھر کو دھر دبایا تو باباجی ایک بے خودی کے عالم میں خود جھک گئے۔ شنکھدھر جب زور مار کر نیچے سے نکل آیا تو باباجی سیدھے ہو گئے اور جب شنکھدھر نے کشتی مار لی۔ تب تو چکردھر اچھل پڑے اور دوڑ کر شنکھدھر کو گلے لگا لیا۔ مارے غرور کے ان کی آنکھیں متوالی ہو گئیں ÷

شنکھدھر کو کبھی کبھی اگر صبر آزما خواہش ہوتی تو یہ کہ پتاجی کے قدموں پر گر پڑوں اور ساری کیفیت صاف صاف بیان کر دوں۔ وہ دل میں قیاس آرائیاں کیا کرتا کہ اگر ایسا کروں تو وہ کیا کہیں گے؟ شاید اسی دن مجھے سوتا چھوڑ کر کسی دوسری طرف کی راہ لیں گے۔ اس خوف سے بات اس کے منہ تک آکے رک جاتی تھی۔ مگر یہ خواہش اسی تک محدود نہ تھی۔ چکردھر بھی کبھی کبھی بیٹے کی محبت سے بے تاب ہو جاتے اور چاہتے کہ اسے گلے لگا کر کہوں کہ بیٹا۔ تم میری آنکھوں کے تارے ہو۔ تمہاری یاد دل سے کبھی نہ اترتی تھی

سب کچھ بھول گیا۔ پر تم نہ بھولے۔ وہ شنکھدھر کے منہ سے اپنے حال کا قصہ غم وادی کی اشک ریزی اور زوجہ کے عیش و غضب کی داستان سننے سے کبھی نہ تھکتے تھے۔ رانی منورما کو ان کا کتنا خیال تھا۔ یہ چرچا سن کر جگدھر بہت رنجیدہ ہو جاتے تھے۔

اس طرح ایک مہینہ گذر گیا اور شنکھدھر کو فکر ہوئی۔ کہ انہیں کسی بہانے سے گھر لے چلو۔ لیکن بہت غور کرنے پر بھی اسے کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ تب اس نے فیصلہ کیا کہ ماں کو خط لکھ کر کیوں نہ یہیں بلا لوں۔ اور خط پاتے ہی سر کے بل دوڑی آئیں گی اور لوگ بھی آئیں گے۔ تب دیکھوں کہ یہ حضرت کس طرح جان بچاتے ہیں۔ وہ پچھتا تا کہ میں ناحق اتنے دنوں کشمکش و پیچ میں پڑا رہا۔ اسی رات کو اس نے اپنی ماں کے نام خط ڈال دیا۔ خط کے اخیر میں لکھا۔ آپ آنے میں توقف نہ کیجئے گا۔ ورنہ پچھتائیں گی۔ یہ اُمید چھوڑ دیجئے کہ میں جگدیشپور راج کا مالک ہوں گا۔ پتا جی کے قدموں کو چھوڑ کر میں ثروت کے مزے نہیں اٹھا سکتا۔ انہیں یہاں سے لے جانا غیر ممکن ہے۔ انہیں اگر معلوم ہو جائے کہ میں انہیں پہچان گیا ہوں تو آج ہی غائب ہو جائیں۔ میں نے ان سے اپنی داستان کہہ دی ہے۔ آپ لوگوں کے حالات بھی سنایا کرتا ہوں۔ پر مجھے انکے چہرے پر ذرا بھی تسکین نہیں نظر آتا۔ جذبات پر انہوں نے اتنا قابو کر لیا ہے۔ آپ جلد سے جلد آئیں۔

وہ ساری رات اسی تخیل میں مگن رہا۔ کہ اماں آجائیں گی تو دادا کو جھک کر سلام کروں گا اور پوچھوں گا کہ اب بھاگ کر کہاں جائے گا۔

مگر اپنی سوچی ہوئی بات کبھی پوری ہوئی ہے۔

ایک مہینہ گذر گیا اور نہ اہلیا ہی آئی نہ کوئی دوسرا ہی۔ شنکھدھر دن بھر

اُس کی راہ دیکھتا رہتا۔ ریل کا اسٹیشن وہاں سے پانچ میل تھا۔ راستہ بھی صاف تھا۔ پھر بھی کوئی نہیں آیا۔ چکردھر جب کہیں چلے جاتے تو وہ چپکے سے اسٹیشن کی راہ لیتا اور گاڑی کے نکل جانے پر مایوس ہوکر لوٹ آتا۔ آخر اُسے ایک دن ایک خط ملا۔ جسے پڑھ کر اُسے بے حد افسوس ہوا۔ اہلیا نے لکھا تھا۔ میں بڑی بدنصیب ہوں۔ تم نے اپنی جان کا ہی کے بعد جس دیوتا کے درشن پائے۔ اس کے درشن کی بہت خواہش ہونے پر بھی یہاں سے ہل نہیں سکتی۔ ایک مہینہ سے بیمار ہوں۔ جینے کی اُمید نہیں۔ اگر تم آجاؤ تو تمہیں ایک نگاہ دیکھ لوں۔ ورنہ یہ حسرت بھی رہ جائے گی۔ میں کئی مہینے سے آگرے میں پڑی ہوں۔ اکیلے جی گھبرایا کرتا ہے۔ اگر کسی طرح سوامی جی کو لا سکو تو آخری وقت ان کی زیارت بھی کرلوں۔ میں جانتی ہوں وہ نہ آئیں گے۔ مگر تم آنے میں ایک لمحہ بھی توقف نہ کرنا ؂

شنکھدھر ڈاک خانہ کے سامنے کھڑا دیر تک روتا رہا۔ اماں بیمار ہیں کیا وہ اُنہیں اس حالت میں چھوڑ کر ایک لمحہ بھی یہاں رُک سکتا ہے اس نے پانچ سال تک ماں کو اپنی خیریت کا کوئی حال لکھ کر اُس کے ساتھ جو سردمہری ظاہر کی ہے اُسے یاد کر کے اُسے سچی ندامت ہوئی۔

اُس کا منہ اُترا ہوا دیکھ کر چکردھر نے پوچھا۔ کیوں بیٹا! آج کچھ اُداس معلوم ہوتے ہو؟

شنکھدھر نے آنکھوں میں آنسو لاکر کہا۔ آج ماتا جی کا خط آیا ہے وہ بہت بیمار ہیں۔ میں پتا جی کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ تو نہ ملے۔ اماں جی بھی رخصت ہوتی جاتی ہیں۔ دادا سے ملاقات ہو جاتی۔ تو میں اُن سے ضرور کہتا......

چکر دھر۔ کیا کہتے ؟ کہو نہ !

شنکھدھر۔ کہہ دیتا۔ کہ آپ ہی ماں جی کے قاتل ہیں۔ آپ کی عبادت اور خدمت کس کام کی۔ جو اپنے گھر والوں کی جانب سے اتنا تغافل ہے۔ آپ کے پاس بڑی بڑی اُمیدیں لے کر آیا تھا۔ مگر آپ کو بھی ایک بے کس یتیم پر درد نہ آیا۔

چکر دھر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ بیٹا میں تمہارے باپ کا پتہ لگا چکا ہوں۔ اُن سے مِل بھی چکا ہوں۔ تمہیں خبر نہیں۔ پر وہ پوشیدہ طور پر تمہیں دیکھ بھی چکے ہیں۔ اُنہیں تم سے جتنی محبت ہے۔ تم اُس کا قیاس بھی نہیں کر سکتے۔ تمہاری ماں کو بھی وہ ہمیشہ یاد کرتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی کا جو راستہ طے کر لیا ہے۔ اُسے چھوڑ نہیں سکتے۔

شنکھدھر۔ آج کل تو اماں جی آگرے ہیں۔ باگیشری دیوی سے ملنے گئی تھیں۔ وہیں بیمار پڑ گئیں۔ لیکن آپ کی پتا جی سے ملاقات ہوئی۔ پھر بھی آپ نے اس کا مجھ سے ذکر نہ کیا۔ اسے میں اپنی بدنصیبی کے سوا اور کیا سمجھوں !

چکر دھر نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سخت آزمائش میں پڑے ہوئے تھے بہت دنوں کے بعد ناگہانی طور پر اپنے بیٹے سے ملنے کا اتفاق ہو گیا تھا۔ وہ ساری آرزوئیں اور خواہشیں جنہیں وہ دِل سے نکال چکے تھے۔ بیدار ہو گئیں تھیں اور اِس وقت صدمہ فراق سے زار وقطار رو رہی تھیں۔ نفس کا وہ پھندہ جسے انہوں نے بڑی مشکلوں سے ڈھیلا کر پایا تھا۔ ہر لمحہ سخت ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا ؛

یکایک شنکھدھر نے روندھے ہوئے گلے سے کہا: تو میں مایوس ہو جاؤں۔!

چکردھر نے دل سے نکلنے والی آہ سرد کو دباتے ہوئے کہا: نہیں بیٹا! ممکن ہے کبھی وہ خود تمہاری محبت سے بے قرار ہوکر خود تمہارے پاس دوڑے آئیں۔ اس کا فیصلہ تمہارے اطوار پر مبنی ہے۔

شنکھدھر۔ آپ کے درشن مجھے پھر کب ہوں گے۔؟ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ آپ کہاں ہے۔ اگرچہ مجھے والد بزرگوار سے نیاز حاصل کرنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن شفقت پدری کا جو تخیل میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ وہ آپکی قدمبوسی نے پورا کر دیا۔ میں نے آپ کو اسی نگاہ سے دیکھا ہے اور ہمیشہ دیکھتا رہوں گا۔ یہ شفقت یہ دستگیری۔ یہ نظر کرم مجھے کبھی نہ بھولیگی۔

چکردھر نے رخصت آمیز لہجہ میں کہا: نہیں بیٹا تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود کبھی تم سے مل جایا کروں گا۔ میری دعا ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گی۔

شام کے وقت شنکھدھر اپنے باپ سے رخصت ہو کر چلا۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ گویا ان کا دل سینے سے نکل کر شنکھدھر کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو انہوں نے ایک لمبی سانس لی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ایسا معلوم ہوا زندگی تاریک ہو گئی ہ

(۴۸)

اہلیا کی آنے کی خبر پاکر محلے کی سینکڑوں عورتیں ٹوٹ پڑیں۔ شہر

کے کئی بڑے گھروں کی عورتیں آ پہونچیں۔ شام تک تانتا لگا رہا۔ کچھ لوگ وفد بنا کر ایواروں کے لئے چندے مانگنے آ پہونچے۔ اہلیا کو ان لوگوں سے جان بچانا مشکل ہو گیا۔ کس کس سے اپنی مصیبت کی داستان کہے اپنی غرض کے باولے اپنی کہتے ہیں۔ کسی کی سننے کی انہیں کہاں فرصت اس وقت اہلیا کو بے سروسامانی سے یہاں آنے پر بڑی شرم آئی۔ اگر جانتی کہ یہاں یہ ہنگامہ بپا ہوگا۔ تو وہ اپنے ساتھ دس بیس ہزار کے نوٹ لیتی آتی۔ اسے اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں ٹھہرنے بھی شرم آتی تھی۔ جب اسے راجکماری کا رتبہ حاصل ہوا۔ وہ شہر سے باہر نہ گئی تھی۔ کبھی کبھی کاشی رہتی۔ کبھی جگدیش پور۔ اب اسے معلوم ہوا کہ دولت محض تن پروری کی چیز نہیں۔ اس سے شہرت اور نیکنامی بھی مل سکتی ہے۔ تن پروری سے تو اسے نفرت ہو گئی تھی۔ لیکن نیکنامی کا شہرہ پہلے ہی بار ملا۔ شام تک اس نے پندرہ بیس ہزار کے چندے لکھ دیئے۔ اور منشی مجبر دھر سے روپیہ بھیجنے کی بھی التجا کی خط پہونچنے کی دیر تھی۔ روپیہ فوراً آ گئے۔ پھر تو اس کے دروازے پر فقیروں کا جمگھٹ رہنے لگا۔ لنگڑے اندھوں سے لے کر جوڑی اور موٹر پر بیٹھنے والے گداگر آ آکر دستِ سوال پھیلانے لگے۔

خواجہ محمود کو بھی خبر ملی۔ وہ بیچارے آنکھوں سے معذور تھے مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ رانی صاحب مجھے ضرور سرفراز فرمائیں گی۔ لیکن جب ایک ہفتہ گذر گیا اور اہلیا نے انہیں سرفراز نہ کیا تو ایک دن لاٹھی ٹیکتے ہوئے آئے اور دروازے پر کھڑے ہو کر بولے خواجہ محمود حضور کو دعا دینے کے لیے حاضر ہوا ہے۔

اہلیا فوراً باہر نکل آئی اور مودبانہ انداز سے بولی۔ آپ نے ناحق تکلیف کی
میں تو خود حاضر ہونے والی تھی۔ مزاج تو اچھے ہیں۔؟
خواجہ۔ خدا کا شکر ہے۔ زندہ ہوں۔ حضور تو خیریت سے ہیں۔
اہلیا۔ آپ کی دعا ہے۔ مگر آپ تو مجھ سے یوں باتیں کر رہے ہیں۔ گویا میں کچھ اور ہو گئی ہوں۔ میں آپ کی گود کی کھلائی ہوئی وہی لڑکی ہوں جو آج سے پندرہ سال پہلے تھی۔ اور آپ کو اسی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔
خواجہ صاحب اہلیا کی مجاجت اور انکسار پر مفتون ہو گئے۔ واللہ کیا شرافت ہے! کتنی خاکساری ہے؟ انسان وہی ہے جو اپنے کو بھول نہ جائے۔ بولے تمہیں خدا نے یہ رُتبہ اعلیٰ بخشا ہے۔ مگر تمہارا مزاج وہی ہے۔ ورنہ کسے اپنے دن یاد رہتے ہیں۔ ثروت پاتے ہی لوگوں کی نگاہیں بدل جاتی ہیں قسم خدا کی میں نے جس وقت تمہیں نالی میں روتے ہوئے پایا۔ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ یہ کسی بڑے گھر کا چراغ ہے اتنی ہمت اتنی دلیری اپنی عصمت کے لئے جان پر کھیل جانے کے لئے یہ جوش۔ شہزادیوں میں ہی ہو سکتا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آپ کو دیکھ کر آنکھیں مسرور ہوئیں۔ تمہاری اماں جان تو اچھی طرح ہیں؟
کیا کروں پڑوس میں رہتا ہوں۔ مگر برسوں آنے کی نوبت نہیں آئی۔
اہلیا۔ آپ انہیں سمجھاتے نہیں۔ کیوں اتنی تکلیفیں جھیلتی ہیں؟
خواجہ۔ بیٹا۔ ایک بار نہیں ہزار بار سمجھا چکا۔ مگر جب وہ خدا کی بندی مانے بھی۔ کتنا کہا کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے۔ جبو دانندن مرحوم سے میرا برادرانہ رشتہ تھا۔ میری جائداد میں تمہارا بھی حصہ ہے لیکن میری گذارش کا مطلق لحاظ نہ کیا۔ تمہیں تو اس مکان میں بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ میرا بنگلہ خالی ہے۔ کوئی ہرج نہ سمجھو تو اس میں

قیام کرو۔

فی الواقع اہلیا کو اس گھر میں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ راتوں کو نیند ہی نہ آتی۔ انسان اپنی عادتوں کو یکایک نہیں تبدیل کر سکتا۔ پندرہ سال سے وہ ایک شاندار محل میں رہنے کی عادی ہو رہی تھی۔ اس تنگ گندے ٹوٹے پھوٹے مکان میں جہاں رات بھر مچھروں کی بھنبھناہٹ بجتی رہتی تھی۔ اُسے کب آرام مل سکتا تھا۔ اگر خواجہ صاحب کی دعوت کو وہ قبول نہ کر سکی۔ بولی۔ نہیں خواجہ صاحب۔ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے آدمی کو اپنے دن نہ بھولنے چاہئیں۔ اسی گھر میں سولہ سال رہی ہوں۔ زندگی میں جو کچھ سکھ دیکھا اسی گھر میں دیکھا۔ اپنے پرانے رفیق کو کیسے چھوڑ دوں۔

خواجہ۔ بابو چکردھر کا اب تک کچھ پتہ نہ چلا؟

اہلیا۔ اس لحاظ سے میں بڑی بدنصیب ہوں۔ خواجہ صاحب! پندرہ سال سے ان کا کوئی پتہ نہیں، پانچ سال سے لڑکا بھی غائب ہے۔ لوگ سمجھتے ہوں گے۔ اس کی سی خوش نصیب عورت دُنیا میں نہ ہوگی اور میں اپنی قسمت کو روتی ہوں۔ ارادہ تھا کہ چل کر کچھ دنوں اماں کے ساتھ اکیلی پڑی رہوں گی۔ مگر ثروت کی بلا یہاں بھی سر سے نہ ٹلی۔ کہئے اب یہاں تو آپس میں فتنہ فساد نہیں ہوگا۔

خواجہ۔ جی نہیں۔ ابھی تک تو خدا کا فضل ہے۔ لیکن دیکھتا ہوں کہ آپس میں وہ پہلے کا سا ارتباط نہیں رہا۔ دونوں قوموں میں کچھ ایسے لوگ ہیں۔ جن کی عزت اور وقار دونوں کے عناد پر قائم ہے۔ بس یہ لوگ ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑا کرتے ہیں۔ میرا تو قول ہے کہ ہندو ہو یا مسلمان

ہو۔ خدا کے سچے بندے رہو۔ ساری خوبیاں کسی ایک ہی قوم کے حصہ میں نہیں آئی ہیں۔ نہ سبھی ہندو کافر ہیں اور نہ سبھی مسلمان مومن۔ اپنے اہل وطن سے جو شخص جتنی بھی نفرت کرتا ہے۔ سمجھ لیجئے کہ وہ خدا سے اتنی ہی دور ہے مجھے آپ سے کمال ہمدردی ہے۔ مگر چلنے پھرنے سے معذور ہوں ورنہ بابو چکر دھر جہاں ہوتے وہاں سے کھینچ لاتا۔

خواجہ صاحب جانے لگے تو اہلیا نے اسلامی یتیم خانہ کے لئے پانچ ہزار کا عطیہ پیش کیا۔ اس سے مسلمانوں کے دلوں پر بھی اس کا سکہ بیٹھ گیا چکر دھر کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔

اہلیا کو اب روز ہی کسی نہ کسی جلسہ پر جانا پڑتا ہے اور وہ بڑے شوق سے جاتی ہے۔ دو ہی ہفتوں میں اس کی کایا پلٹ سی ہو گئی حرص شہرت کا جادو سر پر چڑھنے لگا۔ فی الواقع ان مصروفیات میں وہ اپنی مصیبتیں بھول گئی۔ اچھی اچھی تقریریں تیار کرنے میں اُسے اتنا انہماک رہنے لگا گویا نشہ ہو گیا ہے۔ اور یہ تھا بھی نشہ ہی۔ حرص شہرت سے بڑھکر دوسرا نشہ نہیں۔

باگیشوری پرانے خیالات کی عورت تھی۔ اُسے اہلیا کا یوں گھوم گھوم کر تقریریں کرنا اور روپیے لٹانا اچھا نہ لگتا تھا۔ ایک دن اُس نے کہہ ہی ڈالا۔ کیوں ری اہلیا! کیا تو اپنی ساری دولت لٹا کر رہے گی!

اہلیا نے پُرغرور انداز سے کہا اور دولت ہے ہی کس لئے اماں جی! دولت میں اتنی ہی برائی ہے کہ اس سے تکلیف کا شوق بڑھتا ہے۔ لیکن اس سے ثواب بھی تو ہو سکتا ہے۔

باگیشوری نے ثواب کے نام سے چڑھکر کہا۔ تو جو کر رہی ہے۔ وہ

ثواب نہیں ہے۔ ناموری کی ہوس ہے۔

اہلیا۔ تم تو اماں جی آپے سے باہر ہو جاتی ہو۔

باگیشوری۔ اگر تم دولت کے پیچھے اندھی نہ ہو جاتی تو تجھے یہ خمیازہ نہ اٹھانا پڑتا۔ تیری طبیعت کچھ کچھ ٹھکانے پر آرہی تھی۔ تب تک تجھے یہ نئی سنک سوار ہو گئی۔ ثواب تو ہیں جب سمجھتی۔ جب تم وہیں بیٹھے بیٹھے گمنام طریقہ سے چندہ بھیج دیتی۔ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ اس واہ واہ سے تیرا سر نہ پھر جائے۔ ثروت کا بھوت تیرے پیچھے بُری طرح پڑا ہوا ہے اور تجھے ابھی اور کتنے ہی جھنکوائے گا۔

اہلیا نے ناک سکوڑ کر کہا۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب کیا ہو گا۔ زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے۔ جس کے لئے روؤں۔

دوسرے دن سویرے ڈاکیہ تسکھ دھر کا خط لے کر پہونچا جو جگدیش پور ہوتا ہوا آیا تھا۔ اہلیا خط پڑھتے ہی اُچھل پڑی اور دوڑی ہوئی باگیشوری کے پاس جاکر بولی۔ اماں دیکھو! للو کا خط آ گیا۔ دونوں آدمی ایک ہی جگہ ہیں للو نے اُس کا پتہ لگا ہی لیا۔ مجھے بُلا رہا ہے۔

باگیشوری۔ ایشور کا شکر کرو بیٹی! کہاں ہیں؟

اہلیا۔ دکھن کیطرف ہیں۔ پورا پتہ لکھا ہوا ہے۔

باگیشوری۔ تو بس! اب تو چلی ہی جا۔ چل میں بھی تیرے ساتھ چلونگی۔

اہلیا۔ آج پورے پانچ سال کے بعد للو کا خط آیا ہے۔ مجھے آگرہ آنا پھل گیا۔ یہ تمہاری دُعا کا اثر ہے۔

باگیشوری۔ میں تو اس لڑکے کی جیوٹ کو سراہتی ہوں کہ باپ کا پتہ لگا کر ہی دم لیا۔

اہلیا۔ اس خوشی میں آج جشن منانا چاہیئے اماں!

بالکیشوری۔ جشن پیچھے منانا پہلے وہاں چلنے کی تیاری کرو۔

لیکن سارا دن گذر گیا۔ اہلیا نے سفر کی کوئی تیاری نہ کی۔ وہ سفر کے لئے اب کچھ آمادہ نظر نہ آتی تھی۔ مسرت کا پہلا جوش ختم ہوتے ہی وہ اب اِس دُبدھے میں پڑ گئی تھی کہ وہاں جاؤں یا نہ جاؤں۔ وہاں جانا محض دس پانچ دن یا مہینہ دو مہینہ کے لئے جانا نہ تھا۔ بلکہ راج پاٹ سے ہاتھ دھولینا اور شنکھدھر کی تقدیر کو پلٹنا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ کہ باپ کا پجاری شنکھدھر اُنہیں چھوڑ کسی طرح نہ آئے گا۔ اور میں بھی ممتا کے جول میں پھنس جاؤنگی اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ شنکھدھر کو کسی حیلہ سے بُلا لینا چاہیئے۔ اس کا دل کہتا تھا کہ شنکھدھر آگیا تو اس کا باپ بھی ضرور آئے گا۔ شنکھدھر نے خط میں لکھا تھا کہ پتا جی کو مجھ سے بے انتہا محبت ہے۔ کیا یہ محبت اُنہیں کھینچ نہ لائے گی؟ وہ چاہے سنیاسی ہی کے بھیس میں آئیں پر آئیں گے ضرور۔ اور جب اب کی وہ آئیں گے وہ ان کے پیروں کو پکڑ لے گی تو وہ نہ چھڑا سکیں گے۔ شنکھدھر کی گدی نشینی کے بعد اگر ان کی مرضی ہوگی۔ تو وہ ان کے ساتھ چلی جائے گی اور زندگی کے باقی دن ان کی خدمت میں صرف کرے گی۔ اس وقت وہاں جاکر وہ اپنے بیٹے کی آرزوؤں کا خون نہ کرنا چاہتی تھی۔ جیسے اتنے دنوں ان کے فراق میں جلی ہے اسیطرح کچھ دن اور جلے گی۔ یہ فیصلہ کرکے اُس نے شنکھدھر کو خط لکھا۔ میں بہت بیمار ہوں۔ بچنے کی کوئی امید نہیں۔ بس ایک بار تمہیں دیکھنے کی آرزو ہے۔ تم آجاؤ تو شاید جی اُٹھوں لیکن نہ آئے تو سمجھ لینا اماں مرگئی۔ اہلیا کو یقین تھا کہ یہ خط پڑھکر شنکھدھر دوڑا چلا آئے گا۔

بدنصیب اہلیا تو پھر تن پروری کے جل میں پھنس گئی۔ کیا خواہشیں بھی راکششوں کی طرح اپنے ہی خون سے پیدا ہوتی ہیں۔

شام کے وقت باگیشوری نے پوچھا۔ کیا جانے کا ارادہ نہیں ہے؟ اہلیا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ابھی تو اماں میں نے للو کو بلایا ہے۔ اگر وہ نہ آئے گا تو چلی جاؤں گی۔

باگیشوری۔ للو کے ساتھ کیا پکر دھر بھی آجائیں گے؟ تو ایسا موقع پاکر چھوڑ دیتی ہے۔ نہ جانے ابھی تیری گردش کے کتنے دن باقی ہیں۔

اہلیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے سارے غم بھول کر شنکھدھر کی گدی نشینی کے منصوبہ باندھ رہی تھی۔

(۴۹)

گاڑی سکون کو چیرتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ دفعتاً شنکھدھر ہرش پور کا نام سنکر چونک پڑا۔ وہ بھول گیا۔ میں کہاں جارہا ہوں۔ کس کام سے جارہا ہوں۔ اور میرے رُک جانے سے کتنا کہرام مچ جائے گا۔ کسی غیبی طاقت نے اُسے گاڑی کھول کر اُتر آنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے اسٹیشن کو غور سے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔ وہ ایک لمحہ تک خود فراموشی کی حالت میں دم بخود کھڑا رہا۔ پھر ٹہلتا ہوا اسٹیشن کے باہر چلا گیا۔

ٹکٹ بابو نے پوچھا۔ آپ کا ٹکٹ تو آگرہ کا ہے! شنکھدھر نے لاپرواہی سے کہا کوئی ہرج نہیں۔

وہ اسٹیشن کے باہر نکلا تو اس وقت گھنی تاریکی میں بھی وہ مقام مانوس

سا معلوم ہوا۔ کچھ ایسا گمان ہوا کہ وہ بہت دِنوں یہاں رہ چکا ہے۔ وہ سڑک پر ہولیا اور آبادی کیطرف چلا۔ جوں جوں بستی قریب آتی تھی۔ اس کے پاؤں تیز ہوتے جاتے تھے۔ اُسے ایک عجیب بے چینی سی ہورہی تھی۔ جسکو وہ خود نہ سمجھ سکتا تھا۔ یکایک اُسے سامنے ایک سر بفلک عمارت نظر آئی۔ محل کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ وہ برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ شنکھدھر کو کچھ ایسا خیال ہوا کہ وہیں اُس کا بچپن بیتا ہے۔ اُس محل کا ایک ایک کمرہ اُس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ وفور شوق نے ایسا بے تاب کیا۔ کہ وہ اُڑکر اندر چلا جاتے۔ باغ کے دروازہ پر ایک چوکیدار سنگین چڑھائے کھڑا تھا۔ شنکھدھر کو اندر قدم رکھتے دیکھ کر بولا۔ تم کون ہو؟

شنکھدھر نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ چُپ رہو۔ ہم رانی کے پاس جارہے ہیں۔

یہ رانی کون تھی؟ وہ کیوں اُس کے پاس جا رہا تھا؟ رانی کے اُسکے کیا مراسم تھے؟ یہ سب شنکھدھر کو کچھ نہ یاد آتا تھا۔ دربان کو اُس نے جو جواب دیا تھا۔ وہ بھی اضطراری طور پر اُس کی زبان سے نکل گیا تھا۔ جس نشہ میں انسان کا اپنے حواس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اُس کی زبان اُسکے جسم اُس کے اعضاء اُس کے قابو سے باہر ہو جاتے ہیں وہی حالت شنکھدھر کی ہو رہی تھی۔ چوکیدار اس کے جواب سے کچھ مرعوب ہوگیا۔ اور راستہ سے ہٹ گیا۔ شنکھدھر نے باغ میں قدم رکھا۔ باغ کا ایک ایک پودا ایک ایک کیاری۔ ایک ایک روش۔ ایک ایک مورت۔ حوض۔ سنگ مرمر کا چبوترہ سب جانا پہچانا سا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بے محابہ محل میں جا پہونچا ٭

ایک خادمہ نے پوچھا۔ تم کون ہو؟ شنکھدھر نے جواب دیا۔ سادھو ہوں۔ جاکر مہارانی کو اطلاع دے دے۔

خادمہ۔ مہارانی تو اس وقت پوجا پر ہیں۔ انکے پاس جانے کا حکم نہیں ہے۔

شنکھدھر۔ کیا بہت دیر تک پوجا کرتی ہیں۔؟

خادمہ۔ ہاں! کوئی تین بجے رات پوجا پر سے اٹھیں گی۔ اسی وقت نام کے لئے کچھ کھاکر گھنٹہ بھر آرام کریں گی۔ پھر اشنان کرنے چلی جائینگی۔

شنکھدھر۔ بڑی تپسیا کر رہی ہیں۔

خادمہ۔ اب اور کیسی تپسیا ہوگی مہاراج! نہ کوئی شوق ہے نہ سنگار نہ کسی سے ہنسنا نہ بولنا۔ آدمیوں کی صورت سے کوسوں بھاگتی ہیں۔ رات دن۔ جپ۔ تپ کے سوا کوئی کام ہی نہیں۔ جب سے مہاراج کا بیکنٹھ باس ہوا۔ تبھی سے یہ حال ہے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ اُن سے کچھ کام ہے؟

شنکھدھر۔ سادھو سنتوں سے کسی کا کیا کام ہے۔ مہارانی کے حسن اعتقاد کا شہرہ سنکر چلا آیا۔

خادمہ۔ آپ کی آواز تو معلوم ہوتا ہے کہیں سنی ہے لیکن آپ کو دیکھا نہیں۔

یہ کہتے کہتے وہ یکایک کانپ اٹھی۔ شنکھدھر کی پُرجلال شبیہ میں اُسے اُس صورت کا عکس نظر آیا۔ جسے اُس نے بیس سال پہلے دیکھا تھا۔ وہ مشابہت ہر لمحہ واضح تر ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ گھبرا کر وہاں سے بھاگی۔ اور رانی کملا کے کمرہ میں جاکر ہیبت زدہ کھڑی ہوگئی۔

رانی کملا نے خشمگین آنکھوں سے دیکھ کر پوچھا۔ تو یہاں کیا کرنے آئی؟ اِس وقت یہاں تیرا کیا کام ہے؟

خادمہ بولی۔ مہارانی جی! معاف کیجیے۔ جاں بخشی ہو تو کہوں۔ آنگن میں ایک مہاتما کھڑے آپ کو پُوچھ رہے ہیں۔ میں آپ سے کیا کہوں سرکار۔ ان کی آواز و صورت ہمارے مہاراج سے اتنی ملتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہی کھڑے ہیں۔ نہ جانے کیسی لیلا ہے۔ اگر میں نے کبھی کسی کا بُرا چیتا ہو تو میں سو جنم نرگ بھوگوں۔

رانی کملا پُوجا پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اُسے تسکین دیتی ہوئی بولی ڈرمت۔ خدمت۔ اُنہوں نے تجھ سے کچھ کہا۔

خادمہ۔ میرا تو کلیجہ کانپ رہا ہے۔ اُنہوں نے آپ کا نام لے کر کہا کہ اُنہیں میرے آنے کی اطلاع دے دے۔

رانی۔ اُن کی کیا عمر ہوگی۔

خادمہ۔ سرکار۔ ابھی تو مسیں بھیگ رہی ہیں۔

رانی۔ چل دیکھوں تو کون ہے۔

رانی نے آنگن میں آکر دیکھا تو شنکھ دھر کی نورانی صورت بجلی کی روشنی میں صاف نظر آئی۔ رانی کو سکتہ سا ہوگیا۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ ایک پہاڑ کے غار میں مہندر کا رہنا یاد آیا۔ اُس وقت بھی وہ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کی کتنی ہی مافوق العادت باتیں یاد آئیں۔ جن کا راز ابتک نہ سمجھ سکی تھی۔ پھر ہوائی جہاز پر اُن کے ساتھ بیٹھ کر اُڑنے کی یاد آئی۔ وہ گیت بھی یاد آیا۔ جو اس وقت اُس نے گایا تھا۔ پھر وہ خوفناک انجام نظروں میں پھر گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا۔

کہ میں کھڑی نہ رہ سکونگی۔ کیا اب بھی شبہ کی کوئی گنجایش تھی۔؟ اگرچہ اُس کا دل اُن قدموں سے لپٹ جانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ مگر اس نے ضبط کیا اور بولی۔ مہاراج آپ کون ہیں اور مجھے کیوں یاد کیا ہے ؟

شنکھدھر نے رانی کے قریب جاکر کہا۔ کیا تم مجھے اتنی جلدی بھول گئیں کملا! میں وہی ہوں جس نے نہ جانے کتنے دن ہوئے تمہارے دل میں پریم کے روپ میں جنم لیا تھا۔ اور آج تک اُسی مسرت کی تلاش میں وہ پہاڑ کا غار تمہیں یاد ہے۔ وہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اُڑنا یاد ہے؟ تمہارے اس روحانی نغمہ کی آواز ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے۔

رانی کملا نے انہیں اور کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ وہ دوڑکر اُن کے قدموں پر گر پڑی اور اُنہیں اپنے آنسوؤں سے دھونے لگی۔ جس نورانی مورت کی وہ بیس برسوں سے پوجا کر رہی تھی وہی اُس کے روبرو کسی دیوتا کی طرح کھڑی تھی ؛

دفعتاً شنکھدھر بولے کملا! کبھی تمہیں میری یاد آتی تھی ؟

رانی نے ہاتھ پکڑکر کہا۔ سوامی! آج بیس برس سے تمہاری اُپاسنا کر رہی ہوں۔ مگر آپ اس وقت آتے ہیں۔ جب میرے دل میں محبت نہیں صرف عقیدت اور ارادت ہے۔

رانی کو اپنے ڈھلتے ہوئے شباب کی حسرت نے خاموش کر دیا۔ کیا وہ اس قابل ہے کہ اس حسن و جمال کے پتلے کی محبوبہ بن سکے۔ وہ کالی کالی لمبی زلفیں۔ وہ گل نورس شگفتہ رخسار۔ وہ مخمور متوالی آنکھیں۔ وہ نزاکت وہ شیرینی۔ وہ مستی اب کہاں ہے۔؟

شنکھدھر نے پوچھا۔ یہ کیوں کہتی ہو کملا!

کملا نے آب گوں آنکھوں سے شنکھدھر کیطرف دیکھا۔ اُن حسرتناک خیالات کو زبان پر نہ لاسکی۔ شنکھدھر نے اُس کے اضطراب باطن کو تاڑ کر کہا۔ میری نگاہوں میں تم آج بھی وہی ہو جو آج سے بیس سال پہلے تھی۔ بلکہ تمہاری حقیقی صورت اِس سے کہیں زیادہ دلکش ہے۔ لیکن تمہیں یاد ہے۔ مجھے رشیوں کا وہ بردان ہے۔ جس سے میں ایام کی بدعتوں کو مٹا سکتا ہوں ؎

کملا کو اپنے قلب ماہیت کی یاد آئی اور ایک بار پھر شباب کی گود میں کھیلے گی۔ اِس خیال سے اُس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ترنم پذیر ہو گیا۔ اُسے معاً خیال آیا کہ یہ میری تپسیا کا پھل ہے۔ آنے والی مسرتوں کے خیال نے دل میں ایسی ایسی آرزوئیں بیدار کر دیں۔ جنہیں وہ بہت عرصہ سے دفن کر چکی تھی۔ اس کی وہ ساری تپسیا اور وہ برت دل کو خواہشات کے ہجوم سے پاک نہ رکھ سکی۔ نفس مرا نہیں محض سو گیا تھا۔

یکایک کملا چونک پڑی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ شنکھدھر اُس کے سامنے چلا جا رہا ہے۔ اُس کی وہ نورانی صورت مٹی مٹی سی معلوم ہونے لگی کملا نے گھبرا کر کہا کہ آپ مجھے چھوڑ کر چلے جا رہے ہیں! اتنی جلد۔

شنکھدھر نے متفکر ہو کر کہا۔ میں تو جانے کے لئے نہیں آیا۔

کملا۔ تو آپ مجھے جاتے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں۔

شنکھدھر۔ یہ سنکر مجھے وحشت ہوتی ہے۔ مگر اس کا علاج میرے پاس ہے۔ میرے تجربہ گاہ کی کیا حالت ہے؟

کملا۔ چلئے۔ آپ کو دکھلا لاؤں۔

شنکھدھر۔ اُس آزمائش کے لئے تیار ہو؟

کملا۔ آپ کے رہتے مجھے کیا خوف ہے۔

لیکن تجربہ گاہ میں پہنچکر کملا کا دل بیٹھ گیا۔ جس سکھ کی آرزو اُسے مایا کی تاریکی میں لیئے جاتی ہے۔ کیا اُس سے بقا ہوگی؟ پہلے کی طرح کیا کوئی غیبی کرشمہ اُس کے عیش میں ہارج نہ ہوگا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ نہ جانے کتنے دنوں سے خواہشوں کی اِس گردش میں مٹی جا رہی ہے۔

سُکھدھر نے ایک سنگ مرمر کی چوکی کو صاف کر کے کہا۔ تم اِس پر لیٹ جاؤ۔ اور آنکھیں بند کر لو۔

(۵۰)

راجہ بشال سنگھ کا ذوق مردم آزاری روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ جیوں جیوں اُنہیں اپنی حالتِ زار پر رنج ہوتا۔ ان کے ظلم و ستم بھی بڑھتے تھے اُن کے دِل میں اب ہمدردی۔ رحم یا صبر کے لئے ذرا بھر بھی جگہ نہ تھی۔ جب اُن پر چاروں طرف سے چوٹیں پڑ رہی ہیں۔ ان کی حالت پر پرماتما کو بھی رحم نہیں آتا۔ تو وہ کسی پر کیوں رحم کریں۔ اگر اُن کا بس ہوتا تو اندر لوک کو ویران کر دیتے۔ دیوتاؤں پر ایسے حملے کرتے کہ برتا سُر کی یاد بھول جاتی۔ مگر اندر لوک کا راستہ بند تھا اور اُن کا سارا غصہ اپنی ریاست پر اُترتا تھا۔ اِدھر کچھ دنوں سے اُنہوں نے غیبی حملوں کا جواب دینے کے لئے ایک نیا اسلحہ تیار کیا تھا۔ اُنہیں اولاد سے محروم رکھ کر ان کی اولاد کو گود سے چھین کر مشیت نے ان کے اوپر سب سے بڑا ظلم کیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں اُنہیں پامال کرنے کے لئے سب سے بڑی یہی چوٹ تھی۔ ایسے راجہ صاحب اس کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے

پانچویں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ راجاؤں کے لئے کنیاؤں کی کیا کمی
کئی مہینوں سے اِس شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کئی راج وید رات
دِن میٹھے قسم قسم کے کشتہ اور مقوی ادویات تیار کرتے رہتے تھے۔ راجہ
صاحب یہ شادی اپنی دھوم دھام سے کرنا چاہتے تھے کہ دیوتاؤں کے
کلیجہ پر بھی سانپ لوٹنے لگے ۔

رانی منورما نے اِدھر کئی مہینوں سے ریاست کے معاملات میں دخل دینا
چھوڑ دیا تھا۔ وہ بولتے بھی تو سُنتا کون؟ کہاں تو یہ حال تھا کہ راجہ صاحب
کو اُس کے بغیر ایک لمحہ بھی چین نہ آتا تھا۔ وہی منورما اب دودھ کی مکھی
بنی ہوئی تھی۔ اُس کا جی چاہتا کہ ایک بار راجہ صاحب کے پاس جا کر پوچھے
کہ مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے۔ مگر راجہ صاحب اُسے اس کا موقع نہ دیتے
تھے۔ اُن کے دِل میں ایک خیال جم گیا تھا اور وہ کسی طرح دور نہ ہوتا تھا
اُنہیں یقین تھا کہ منورما ہی نے رو ہنی کو زہر دے کر مار ڈالا۔ اِس کا کوئی
ثبوت ہو یا نہ ہو پر یہ بات اُن کے دِل میں پتھر کی لکیر ہو گئی تھی۔

منورما کو آئے دِن کوئی نہ کوئی ذلت برداشت کرنی پڑتی تھی لیکن
وہ ذکی الحس منورما اب صبر و توکل کا اتھاہ ساگر ہے۔ جس میں ہوا کے
ہلکے ہلکے جھونکوں سے کوئی تلاطم نہیں ہوتا۔ وہ مسکرا کر ہر ایک وار
کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ اِس تبسم میں کتنا درد۔ آفات کو حقیر سمجھنے
کی کتنی طاقت بھری ہوئی ہے۔ اِسے کون جانتا ہے۔ نئی رانی صاحبہ
کے لئے نیا محل بنوایا جا رہا تھا۔ اُس کی سجاوٹ کے لئے ایک بڑے
آئینہ کی ضرورت تھی۔ شاید بازار میں اتنا بڑا آئینہ نہ مل سکا۔ حکم ہوا کہ
چھوٹی رانی کے دیوان خانہ کا بڑا آئینہ اتار لاؤ۔ منورما نے یہ حکم سُنا اور

مُسکرا دی۔ پھر قالین کی ضرورت پڑی۔ پھر وہی حکم ہوا۔ منورما نے مُسکرا کر ساری قالینیں دیدیں۔ اِس کے کچھ دنوں بعد حکم ہوا۔ چھوٹی رانی کی موٹر نئے محل میں لائی جاتے۔ منورما اِس موٹر کو بہت پسند کرتی تھی۔ اور اُسے خود چلاتی تھی۔ یہ حکم سُنکر مُسکرا دی۔

منورما کے پاس بہت سی لونڈیاں تھیں۔ اِدھر گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد تین تک پہونچ گئی تھی۔ ایک دن حکم ہوا۔ اِن میں سے دو لونڈیاں نئے محل میں تعینات کی جائیں۔ اِس کے ایک ہفتہ بعد وہ ایک بھی بلالی گئی منورما کے یہاں کوئی لونڈی نہ تھی۔ اِس حکم کا بھی مُسکرا کر اُس نے خیر مقدم کیا۔

مگر ابھی سب سے کاری چوٹ باقی تھی۔ نئی رانی کے لئے نیا محل تو بن ہی رہا تھا۔ اُن کی والدہ کے لئے ایک دوسرے مکان کی ضرورت پڑی۔ راجہ صاحب نے نئے محل میں ان کا قیام مناسب نہ سمجھا۔ اِسلئے حکم ہوا کہ چھوٹی رانی کا محل خالی کرالیا جائے۔ رانی نے یہ حکم سُنا اور مُسکرا دی۔ جس حصے میں پہلے مہریاں رہتی تھیں۔ اُسی کو اس نے اپنا مسکن بنا لیا۔ وہاں بھی وہ اتنی ہی خوش تھی۔

ایک دن گرد سیوک منورما سے ملنے آئے۔ راجہ صاحب کی خفگی کا پہلا وار اُنہیں پر ہوا تھا۔ وہ دربار سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ وہ اب اپنی زمینداری کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اختیار چھن جانے پر اختیار کے دُشمن ہو گئے تھے۔ اب وہ پھر کسانوں کی تنظیم کرنے لگے تھے۔ بیگار کے خلاف ان کی آواز پھر بلند ہونے لگی تھی۔ منورما پر یہ ساری بدعتیں دیکھ دیکھ کر اُن کا غصہ مشتعل ہوتا رہتا تھا۔ جس دن اُس نے سُنا کہ منورما اپنے

محل سے نکال دی گئی۔ ان کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی۔

منورما نے ان کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھا تو کانپ اٹھی۔

گروسیوک نے آتے ہی آتے پوچھا۔ تم نے اپنا محل کیوں چھوڑ دیا۔

منورما۔ کیا کرتی۔

گروسیوک۔ کیوں نہیں کہدیا نہ خالی کروں گی۔

منورما۔ میں نے کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ مجھے یوں ہی کونسا ایسا بڑا سکھ تھا، جو اس محل کے چھوڑنے کا دکھ ہوتا۔ میں یہاں بھی خوش ہوں۔

گروسیوک۔ میں دیکھتا ہوں کہ بڈھا دن بدن سٹھیا تا جاتا ہے۔ شادی کے پیچھے اندھا ہوگیا ہے۔

منورما۔ بھیا! آپ میرے سامنے ایسے کلمے منہ سے نہ نکالیں۔ آپکے پیروں پڑتی ہوں۔

گروسیوک۔ تم باتوں کی کہتی ہو۔ میں اس کی مرمت کرنے کی فکر میں ہوں۔ شادی کا مزہ چکھاؤں گا۔

منورما کے ابروؤں پر بل پڑ گئے۔ بولی بھیتہ! میں پھر کہتی ہوں آپ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ اس وقت اپنی ہوش میں نہیں ہیں۔ وہی کیا، کوئی آدمی ایسی چوٹیں کھاکر اپنے ہوش میں نہیں رہ سکتا۔ میں یا آپ ان کے دلی جذبات کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ جس شخص نے ایک آرزو کو چالیس سال تک دل میں پالا ہو اُسی ایک آرزو کے لئے جائز اور ناجائز سب کچھ کیا ہو اور چالیس سال کے بعد جب اُس کے آرزو کے پورے ہونے کے سامان ہوگئے ہوں۔ یکایک اُس کے گلے پر چھری چل جائے تو سوچئے اس شخص کی کیا حالت ہوگی۔

راجہ صاحب نے سر پٹک کر جان نہیں دے دی۔ یہی کیا کم ہے۔ کم سے کم میں تو اتنا صبر نہ کر سکتی۔

گروسیوک۔ اچھا! رعایا پر اتنا ظلم کیوں ہو رہا ہے۔؟ یہ بھی بے ہوشی ہے۔؟

منورما۔ بیہوشی نہیں تو اور کیا ہے۔ جو آدمی پینسٹھ سال کی عمر میں اولاد کے لئے شادی کرے وہ بیہوش ہی ہے۔ چاہے اسمیں بیہوشی کی کوئی علامت ہو یا نہ ہو۔

گروسیوک شرمندہ ہوکر اور مایوس ہوکر جب یہاں سے چلنے لگے تو منورما کھڑی ہوگئی۔ اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ بھیتیہ اگر کوئی خدشہ کی بات ہو تو مجھے بتلا دو۔ گروسیوک نے آنکھیں نیچے کرکے کہا۔ خدشہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ خدشہ کی کون بات ہو سکتی ہے بھلا۔

منورما۔ تم میری طرف تاک نہیں رہے ہو۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے۔ اگر راجہ صاحب پر ذرا بھی آنچ آئی تو بُرا ہوگا۔ جو بات ہو صاف صاف کہدو۔

گروسیوک۔ مجھ سے اور راجہ صاحب سے مطلب ہی کیا ہے۔ اگر تم خوش ہو تو مجھے اُن سے کونسی دشمنی ہے۔ رہی رعیت۔ وہ جانے اور راجہ صاحب جانیں۔ مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔ مگر بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔ وہ ٹھوکریں مارتے ہیں۔ اور تم اُن کے پاؤں سہلاتی ہو۔ کیا سمجھتی ہو۔ تمہاری اس خوشامد سے راجہ صاحب پھر تم سے خوش ہو جائینگے؟

منورما نے بھائی کی طرف مجبور نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ اگر ایسا سمجھتی ہوں تو کیا کوئی بُرائی کرتی ہوں۔ اُن کی خوشی کی پرواہ نہیں تو پھر کس کی

خوشی کی پرواہ کروں گی۔ ہمارا دھرم کینہ رکھنا نہیں سکھاتا ہے۔ میری شادی ہوئے بیس سال سے زیادہ ہوتے ہیں۔ بہت دنوں تک مجھ پر ان کی عنایت کی نظر رہی ہے۔ اب وہ مجھ سے تنے ہوتے ہیں۔ شاید میری صورت سے بھی اُنہیں نفرت ہو۔ لیکن آج تک انہوں نے ایک بھی کڑی بات نہیں کہی ہے۔ سنسار میں ایسے کتنے مرد ہیں۔ جنہیں اپنی زبان پر اتنا قابو ہو۔ کیا ان باتوں کو میں کبھی بھول سکتی ہوں! میں تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ اگر کوئی خوف کی بات ہو تو تم مجھے بتلا دو۔ گرو سیوک نے بغلیں جھانکتے کہا۔ میں تو کہہ چکا۔ مجھے ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔

گرو سیوک نے آگے قدم بڑھایا۔ لیکن منورما نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنی طرف کھینچتی ہوئی بولی۔ تمہارا بشرہ کہے دیتا ہے کہ تمہارے دل میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ جب تک مجھے نہ بتاؤ گے میں تمہیں جانے نہ دونگی۔

گرو سیوک۔ نورا! تم ناحق ضد کرتی ہو۔ اگر میں قیاس سے کوئی بات کہے دوں تو تم کیا کر لو گی۔

منورما۔ اگر روک سکوں گی تو روکونگی۔

گرو سیوک۔ اُسے تم نہیں روک سکتی اور نہ میں روک سکتا ہوں منورما نے گھبرا کر کہا کچھ منہ سے کہو گے بھی۔

گرو سیوک۔ رعایا راجہ صاحب کے ظلم سے تنگ آگئی ہے۔

منورما۔ یہ تو میں پہلے سے جانتی ہوں۔ ہندوستان بھی تو انگریزوں سے تنگ آگیا ہے۔ مگر اس سے کیا۔

گرو سیوک۔ بس اتنا ہی بتلائے دیتا ہوں کہ راجہ صاحب سے کہہ دینا

شادی کے دن ہوشیار رہیں۔

گروسیوک لپک کر باہر چلے گئے۔ اور منورما کے ایک سکتہ کے عالم میں کھڑی ہوئی سوچنے لگی۔ اِس کا مطلب کیا ہے

کل ہی شادی کا دن تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ علے الصبح برات یہاں سے جانے والی تھی۔ سوچنے بچارنے کا موقع نہ تھا۔ اسی وقت راجہ صاحب کو ہوشیار کر دینا ضروری تھا۔ کل موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اُس نے راجہ صاحب کے پاس جانے کا فیصلہ کیا اور اُسیوقت دیوان خانہ کیطرف چلی۔ ایسے خطرہ کی حالت میں وہ سرد مہری نہ کر سکی۔ چار سال کے بعد اُس نے راجہ صاحب کی خواب گاہ میں قدم رکھا۔ جگہ وہی تھی پر کتنی بدلی ہوئی۔ پودوں کے گملے سوکھے پڑے تھے۔ چڑیوں کے پنجرے خالی۔ راجہ صاحب کہیں باہر جانے کے لئے تیار تھے۔ میز پر بیٹھے جلدی جلدی کوئی خط لکھ رہے تھے۔ منورما کے دیکھتے ہی چونک کر اُٹھے اور دروازہ پر لپکے۔ گویا کوئی خوفناک درندہ سامنے آگیا ہو۔

منورما نے سامنے کھڑی ہو کر کہا۔ میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کہنے آئی ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے ٹھہر جایئے۔

راجہ صاحب کچھ جھجک کر کھڑے ہو گئے۔ جس ظالم کے خوف سے ساری ریاست میں کہرام مچا ہوا تھا۔ جس کی آواز سُنکر لوگوں کا خون خشک ہو جاتا تھا۔ جس کے روبرو جانے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ وہ محض ایک مشت استخوانی تھا۔ جسے دیکھکر رحم آتا تھا ؛

اور یہ بندہ نفس شادی کرنے جا رہا تھا۔ جس کے آرزوں پر پڑا ہوا پالا۔ سر سو کچھ اور ابروں پر چھایا ہوا تھا دہی اپنی جھکی ہوئی کمر اور

کانپتی ہوئی ٹانگوں سے شادی کے منڈپ کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ ہوس کی کتنی عبرت ناک تصویر تھی۔

منورما نے پُراسرار لہجہ میں کہا۔ ایک لمحہ کے لئے بیٹھ جائیے۔ میں آپکا بہت وقت نہیں لونگی۔

راجہ۔ بیٹھوں گا نہیں۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ جو بات کہنی ہو۔ چٹ پٹ کہدو۔ مگر نصیحت کا دفتر مت کھولنا۔

منورما۔ میں آپ کو کیا نصیحت دونگی۔ صرف اتنا ہی کہنے آئی ہوں کہ کل برات میں ہوشیار رہئے گا۔

راجہ۔ کیوں۔؟

منورما۔ فساد ہو جانے کا خوف ہے۔

راجہ۔ بس اتنا ہی کہنا ہے۔ یا کچھ اور؟

منورما۔ بس اتنا ہی۔

راجہ۔ تو تم جاؤ! میں فتنہ اور فساد کی پرواہ نہیں کرتا۔ لٹیروں کا خوف اُنہیں ہوتا ہے جن کے پاس سونے کی گٹھڑی ہوتی ہے۔ میرے پاس کیا ہے جس کے لئے ڈروں۔

یکایک اُن کا چہرہ تند ہو گیا۔ آنکھوں میں ایک بیفکری چمک پیدا ہو گئی بولے مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔ اگر کسی نے چوں بھی کیا تو ریاست میں آگ لگا دوں گا۔ بشال سنگھ ریاست کا مالک ہے۔ اُس کا غلام نہیں۔ کون ہے جو میرے سامنے آنکھیں سیدھی کر سکے۔

منورما کا دل درد سے تڑپ اٹھا۔ اِن لفظوں میں کتنی روحانی خلش بھری ہوئی تھی۔ یہ ہوش کی باتیں نہ تھیں۔ بیہوشی کی بڑ تھی۔ مِصر ہو کر بولی۔ پھر بھی

ہوشیار رہنے میں تو کوئی برائی نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔
راجہ نے منورما کی طرف مشتبہ آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ نہیں نہیں۔ تم میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ کسی طرح نہیں۔ بامیں تم کو خوب جانتا ہوں۔
یہ کہتے ہوئے راجہ صاحب باہر چلے گئے۔ منورما کھڑی سوچتی رہ گئی۔ اسکا کیا مطلب ہے۔ ان الفاظ میں جو بدگمانی چھپی ہوئی تھی۔ اگر اس کی بو بھی اُسے مل جاتی۔ تو شاید اُس کا دل پھٹ جاتا۔ وہ وہیں کھڑی کھڑی چلاکر رو پڑی۔ اُس نے سمجھا شاید راجہ صاحب کو اُسے اپنے ساتھ رکھنے میں وہی تامل ہے۔ جو ہر ایک مرد کو عورتوں سے مدد لینے میں ہوتا ہے۔ اسوقت وہ لوٹ گئی۔ لیکن یہ کھٹکا اسے برابر لگا ہوا تھا۔
رات خوب بھیگ چکی تھی۔ باہر برات کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایسا شاندار جلوس نکالنے کا انتظام ہو رہا تھا۔ جیسا اس شہر میں کبھی نہ نکلا ہو۔ گوری فوج تھی۔ کالی فوج تھی۔ ریاست کی فوج تھی۔ فوجی بینڈ تھا۔ ریاست کا بینڈ تھا۔ کوتل گھوڑوں کی لمبی قطار۔ سجے ہوئے ہاتھیوں کی ایک پوری لائن پھولوں سے سجائے ہوئے۔ سواری گاڑیاں۔ خوبصورت پالکیاں۔ بھی قسم کے موٹر کار اتنا سامان تھا۔ کہ شام سے پہر رات تک تانتا ہی نہ ٹوٹے۔ صدہا تخت سجائے گئے تھے اور پھلواریوں کی تو کوئی گنتی ہی نہ تھی۔ ساری رات دروازہ پر چہل پہل رہی۔ راجہ صاحب آرائش کے انتظام میں منہمک رہے۔ منورما کئی بار اُن کے دیوان خانہ میں آئی اور اُنہیں وہاں نہ دیکھ کر لوٹ گئی۔ اُس کے جی میں بار بار آتا تھا۔ کہ باہر ہی چل کر راجہ صاحب سے آرزو منت کروں۔ لیکن خوف یہی تھا کہ کہیں وہ سب کے سامنے بک جھک نہ کرنے لگیں۔ جو اپنے ہوش میں نہیں۔ اُسے کس کی شرم اور کس کا لحاظ۔

آخر جب کسی طرح جی نہ مانا۔ تو دروازہ پر جاکر کھڑی ہو گئی۔ کہ شاید راجہ صاحب اُسے دیکھ کر اس کی طرف آئیں۔ لیکن اُسے دیکھ کر راجہ صاحب اور دُور نکل گئے۔

سارے شہر میں اُس جلوس اور اُس شادی کا مضحکہ اڑایا جا رہا تھا۔ نوکر چاکر سب آپس میں ہنستے تھے۔ راجہ صاحب کی چٹکیاں لیتے تھے۔ لیکن اپنی دھن میں مست راجہ صاحب کو کچھ نہ سُنائی دیتا تھا۔ ساری رات بیت گئی اور منورما کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔ تب وہ اپنی کوٹھڑی میں لوٹ آئی اور ایسا پھُوٹ پھُوٹ کر روئی۔ گویا اُس کا کلیجہ باہر نکل پڑے گا۔ اُسے آج سے بیس سال پہلے کی بات یاد آئی۔ جب اُس نے شادی سے پہلے راجہ صاحب سے کہا تھا۔ مجھے آپ سے محبت نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے۔ مگر آج وہ بڑی خوشی سے راجہ صاحب کے لئے اپنی جان نثار کر رہی ہے یہ اُس لازوال محبت کی برکت تھی۔ جس سے وہ پندرہ سال تک بہرہ اندوز رہی اور جس کی ایک ایک بات اُس کے دل پر نقش ہو رہی تھی۔ ان نقوش کو کون اُس کے دل سے مٹا سکتا ہے۔ سرد مہری میں اتنی طاقت نہیں۔ بے وفائی میں اتنی طاقت نہیں۔ بے عزتی میں اتنی طاقت نہیں یہاں تک کہ موت میں بھی اتنی طاقت نہیں۔ محبت لافانی ہے۔ زندہ جاوید ہے۔

دوسرے دن برات نکلنے سے پہلے منورما پھر راجہ صاحب کے پاس جانے کو تیار ہوئی۔ لیکن کمرہ سے نکلی ہی تھی۔ کہ دو مسلح سپاہیوں نے اُسے روک دیا۔

رانی نے تند لہجہ میں کہا۔ ہٹ جاؤ نمک حرامو۔ میں نے ہی تمہیں نوکر

رکھا۔ اور تم مجھ ہی سے گستاخی کرتے ہو۔

ایک سپاہی بولا۔ حضور کے حکم کے تابعدار ہیں۔ مہاراج کا حکم ہے کہ حضور یہاں سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ ہمارا کیا قصور ہے سرکار۔

منورما۔ نہیں کس نے یہ حکم دیا۔ ؟

سپاہی۔ خود مہاراجہ صاحب نے۔

منورما۔ میں صرف ایک منٹ کے لئے راجہ صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔

سپاہی۔ بڑی کڑی تاکید ہے سرکار! ہماری جان نہ بچے گی۔

منورما اینٹھ کر رہ گئی۔ ایک دن ساری ریاست اُسکے اشارہ پر چلتی تھی۔ آج پہرہ کے سپاہی تک اُس کی بات نہیں سُنتے۔ تب میں اور اب میں کتنا فرق ہے۔

منورما نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ برات نکلنے میں کتنی دیر ہے ؟

سپاہی اب کچھ دیر نہیں ہے۔ سب تیاریاں ہو چکی ہیں۔

منورما۔ راجہ صاحب کی سواری کے ساتھ پہرہ کا تو خاص انتظام کیا گیا ہے ؟

سپاہی۔ ہاں حضور! مہاراج کے ساتھ ایک سو گورے ہوں گے۔ مہاراج کی سواری اُنہیں کے بیچ میں ہوگی۔

منورما مطمئن ہو گئی۔ راجہ صاحب ہشیار ہو گئے۔ یہی اس کا منشا تھا وہ اپنے کمرہ میں لوٹ آئی۔

چار بجتے بجتے برات نکلی۔ طرح طرح کے باجے بج رہے تھے۔ اشرفیاں روپے لٹائے جا رہے تھے۔ قدم قدم پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ شہر

تماشہ دیکھنے کو پھٹا پڑتا ہے۔

اسیوقت اہلیا اور شنکھدھر شہر میں داخل ہوئے۔ جب اُنہیں معلوم ہوا کہ راجہ بشال سنگھ کی برات ہے تو انہوں نے راجہ صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ دم کے دم میں ساری برات رُک گئی۔ کنور صاحب آ گئے۔ یہ خبر ہوا کے ایک جھونکے کی طرح اِس سرے سے اُس سرے تک دوڑ گئی۔ جو جہاں تھا۔ وہیں کھڑا رہ گیا۔ راجہ صاحب نے شنکھدھر کو دیکھتے ہی گھوڑے سے کود کر اُسے سینہ سے لگا لیا۔ وہ آرزو پوری ہو گئی۔ جس کے نام کو روپچکے تھے۔ بار بار کنور کو چھاتی سے لگاتے تھے۔ پر آسودگی نہ ہوتی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ جب ذرا طبیعت کو سکون ہوا تو بولے تم آ گئے بیٹا! مجھ پر بڑی دیا کی۔ اپنے باپ کو بھی لائے ہو نہ؟

شنکھدھر نے کہا۔ وہ تو نہیں آئے۔

راجہ۔ آئیں گے۔ میرا دل کہتا ہے۔ میں تو زندگی سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ تم چلے گئے۔ تمہاری ماں بھی چلی گئی۔ پھر میں کس کا منہ دیکھ کر جیتا۔

شنکھدھر۔ اماں تو میرے ساتھ ہیں۔

راجہ۔ اچھا وہ بھی آ گئیں۔ واہ میرے ایشور! ساری خوشیاں ایک ہی دن کے لئے جمع کر رکھی تھیں۔ دونوں اُسیوقت اہلیا کے پاس آئے باپ اور بیٹی کی ملاقات کا نظارہ نہایت مسرت انگیز تھا۔ جب آنسوؤں کا سیلاب کچھ کم ہوا۔ تو راجہ صاحب بولے۔ تمہیں یہ برات دیکھ کر ہنسی آئی ہوگی۔ سبھی ہنس رہے ہیں۔ لیکن بیٹا یہ برات نہیں ہے۔ کیسی برات اور کیسا دولہا۔؟ یہ ایک مجنوں دل کی تڑپ ہے اور کچھ نہیں۔ دل کہتا تھا جب ایشور کو میری پرواہ نہیں۔ وہ مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں کرتے۔ تو بے

سبب مجھے ستاتے ہیں تو میں کیوں اُن کا احترام کروں۔ جب آقا کو خادم کی فکر نہیں تو خادم کو آقا کی کیوں فکر ہونے لگی۔ میں نے خوب پیٹ بھر کے ظلم کیا۔ حق اور ناحق۔ روا اور ناروا کے سارے خیالات دل سے نکال ڈالے۔ اور آخر میں میری اُس پر فتح ہوئی۔

اہلیا۔ للو اپنے لئے رانی بھی لیتا آیا۔

راجہ۔ سچ کہنا۔ یہ تو بڑا مزہ رہا۔ وہ بھی ساتھ ہے؟ تب تو یہ میری برات کا جلوس نہیں شنکھدھر کی شادی کا جشن ہے۔

(۵۱)

کملا کو جگدیش پور میں آکر ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک جُگ کے بعد گھر آئی ہے۔ وہاں کی سبھی چیزیں۔ سبھی آدمی اُس کے جانے پہچانے تھے۔ اور ان کی حالتوں میں کتنا تغیر ہو گیا تھا۔ اُس کا [illegible] گھر بالکل ویران پڑا ہوا تھا۔ لتائیں خشک ہو گئی تھیں فوارے سوکھے پڑے ہوئے تھے صرف لمبے ستون باقی تھے۔ مگر کملا کو ناچ گھر کی بربادی کا ذرا بھی غم نہ ہوا۔ اسکے برعکس اس کی یہ حالت دیکھ کر اُسے ایک قسم کی [illegible] ہوئی۔ کتنی ہی پرانی باتیں اُس کی آنکھوں میں پھر گئیں۔ کتنی ہی یادگاریں تازہ ہو گئیں۔ وہ مقام ہے جہاں اُس بدنصیب نے اپنے شوہر کو نہ پہچان کر اسکے لئے اپنی محبت کا جال پھیلایا تھا۔ کاش وہ پرانی باتیں فراموش ہو جاتیں۔ اُس عیش پرور زندگی کی یاد اُس کے دل سے مِٹ جاتی۔ اُن باتوں کو یاد رکھتے ہوئے کیا اُس کو اِس زندگی میں سکون ہو سکتا تھا۔؟ [illegible] تھا کہیں غیب سے نکل کر اُسے ڈرانے لگا۔

ناچ گھر سے نکل کر دیو پریا رانی منورما کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ حسن کی وہ لطافت اور شوخی رخصت ہو چکی تھی۔ جن زلفوں کو ہاتھ میں لے کر اس نے اپنے دل میں ایک کیفیت کا احساس کیا تھا۔ وہ اس طرح اُلجھی پڑی تھی۔ گویا مہینوں ان کی کسی نے خبر نہ لی ہو۔ جن آنکھوں میں شباب کی اُمنگیں رقص کرتی تھیں۔ وہاں حسرت ماتم کر رہی تھی۔ یاس اور عبرت کی ایک تصویر تھی جسے دیکھ کر دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔

منورما بولی۔ ناچ گھر دیکھنے گئی تھی۔ ؟ آجکل تو بے مرمت پڑا ہوا ہے اُس کی رونق تو رانی دیو پریا کے ساتھ گئی۔

کملا نے آہستہ سے کہا۔ وہاں آگ کیوں نہ لگ گئی۔ یہی تعجب ہے۔

منورما۔ کیا وہ داستان سن چکی ہو۔

کملا۔ ہاں جتنا جانتی ہوں اتنا ہی بہت ہے۔

یہاں سے وہ رانی رام پریا کے پاس گئی۔ اور اُسے دیکھ کر بڑی مشکل سے آنسوؤں کو روک سکی۔ آہ! جس لڑکی کو اُس نے ایک دن گود کھلایا تھا وہ اُس کی ماں سی معلوم ہوتی تھی۔

کملا نے بینا کو دیکھ کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو گانے سے بہت شوق ہے۔

رام پریا اُس کی طرف ٹکٹکی باندھکر دیکھنے لگی۔ شاید کملا کی بات اُسکے کانوں تک پہونچی ہی نہیں۔

کملا نے پھر کہا۔ میں بھی آپ سے کچھ سیکھنا چاہتی ہوں۔

رام پریا ابھی تک اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ کوئی جواب نہ دیسکی۔
کملا پھر بولی۔ آپ کو بہت دردسر نہ لینا پڑے گا۔ میں کچھ کچھ گانا

جانتی ہوں۔

یہ کہہ کر اُس نے بینا اٹھالی اور گانے لگی۔

پربھو کے درشن کیسے پاؤں ؟

یہی گیت تھا جو رام پریا نے کتنی ہی بار دیوپریا کو گاتے سُنا تھا۔ وہی آواز تھی۔ وہی شیرینی تھی۔ وہی لوچ تھا۔ وہی دل میں چبھنے والی تان تھی رام پریا نے ہیبت زدہ آنکھوں سے کملا کو دیکھا اور بے ہوش ہو گئی۔ کملا اُسے بیہوش ہوتے دیکھ کر سہم اُٹھی۔ وہ رام پریا کو اُسی حالت میں چھوڑ کر اِس طرح اپنے محل کو چلی گویا کوئی اُسے ڈرا رہا ہو۔

منورما کو جیوں ہی ایک لونڈی سے رام پریا کے غش کھانے کی خبر ملی وہ دوڑی ہوئی اُس کے پاس آئی۔ اور اُسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی کئی منٹ کے بعد رام پریا نے آنکھیں کھولیں۔ وہ پھر سہم اُٹھی اور گھبرائی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔

منورما نے پوچھا۔ آپ کو یہ یکایک کیا ہو گیا۔ ؟ ابھی تو بہن جی یہاں بیٹھی گا رہی تھیں۔

رام پریا نے منورما کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ کچھ کہنے نہیں بنتا بہن! معلوم نہیں آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ یا کیا بات ہے ؟ بہو کی صورت بالکل دیوپریا بہن سے ملتی ہے۔ رتی بھر کا بھی فرق نہیں۔

منورما۔ کچھ کچھ ملتی تو ہے۔ مگر اِس سے کیا ؟ ایک ہی صورت کے دو آدمی کیا نہیں ہوتے ؟

رام پریا۔ نہیں منورما! بالکل وہی صورت ہے۔ رنگ۔ ڈھنگ بول چال سب وہی ہے۔ گیت بھی اس نے ویسا ہی گایا۔ جو دیو پریا بہن گایا کرتی تھیں۔ بالکل وہی سُر تھا۔ وہی آواز۔ تم سے کیا کہوں بہن! تل اور ماشے کا بھی تو فرق نہیں۔ تم نے دیو پریا کو جوانی میں نہیں دیکھا۔ میری آنکھوں میں تو آج بھی اُن کی وہ موہنی صورت پھر رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہن خود کہیں سے آگئی ہے۔ کیا راز ہے۔ کہہ نہیں سکتی۔ مگر یہ دیو پریا ہے۔ اسمیں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں۔

منورما۔ راجہ صاحب نے بھی تو رانی دیو پریا کو جوانی میں دیکھا ہوگا؟

رام پریا۔ ہاں! دیکھا ہے۔ دیکھ لینا وہ بھی یہی بات کہیں گے صورت کا ملنا اور بات ہے اور وہی ہو جانا اور بات ہے۔ چاہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ دیو پریا بہن پھر اوتار لے کر آئی ہیں۔

منورما۔ ہاں یہ بات ہو سکتی ہے۔

رام پریا۔ سب سے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس نے گیت بھی وہی گایا جو دیو پریا کو بہت پسند تھا۔ اُسے جو کچھ عیش و آرام کرنا تھا کر چکی۔ اب یہاں کیا کرنے آئی ہے۔؟ مجھے تو شگون بُرے معلوم ہوتے ہیں۔

منورما۔ آپ تو ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ گویا وہ اپنی خوشی سے آئی ہیں۔

رام پریا۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔ اور تم کیا سمجھتی ہو۔؟ میں نے کتنی کتابوں میں پڑھا ہے۔ آدمی اپنی زندگی کا ادھورا کام پورا کرنے کے لئے اُسی گھر میں جنم لیتا ہے۔ اس کی کتنی ہی مثالیں ملتی ہیں۔

منورما۔ لیکن رانی دیو پریا تو خود راج پاٹ چھوڑ کر تیرتھ جاترا کرنے

گئیں تھیں۔

رام پریا۔ کیا ہوا۔ اُن کی ہوس باقی تھی۔ اگر وہی ہوس اُنہیں پھر کھینچ لائی ہے تو خیریت نہیں۔

منورما۔ آپ کی باتیں سُنکر تو مجھے بھی شُبہ ہونے لگا۔

اسیوقت اہلیا سامنے سے نکل گئی۔ غرور آمیز مسرت سے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ مشیعت کس طرح اپنا جال پھیلاتی ہے۔ اس کی اُسے کیا خبر؟

(۵۲)

منشی بجردھر نے یہ مژدہ سُنا تو فوراً گھوڑے پر سوار ہوئے اور قصر شاہی میں آپہونچے۔ شنکھدھر اُنکے آنے کی خبر پاکر ننگے پاؤں دوڑا اور اُنکے قدموں پر گر پڑا۔ منشی جی نے پوتے کو چھاتی سے لگا لیا اور بولے! یہہ مبارک دن دیکھنا بدا تھا۔ اِسی سے اب تک زندہ ہوں۔ اب اتنی آرزو اور ہے کہ تمہارا راج تلک دیکھ لوں۔ تمہاری دادی بیٹھی تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ کیا اُنہیں بھول گئے؟ شنکھدھر نے شرماتے ہوئے کہا۔ جی نہیں! شام کو جانے کا ارادہ تھا۔ اُنہیں کی دُعا سے تو میں منزل مقصود پر پہونچا۔ منشی جی نے پُوچھا تم لالو کو اپنے ساتھ نہ کھینچ لائے۔

شنکھدھر۔ وہ اِس وقت میرے ساتھ نہ آتے۔ میں نے اپنے تئیں ظاہر نہیں کیا۔ ورنہ وہ مجھ سے ملنا بھی گوارا نہ کرتے۔ اِس کے بعد شنکھدھر نے اپنی سیاحت کا۔ اپنی مُشکلات کا اور چکردھر سے ملنے کا سارا قصہ کہہ سُنایا۔ یوں باتیں کرتے ہوئے منشی راجہ صاحب کے پاس جا پہونچے۔

راجہ صاحب نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اور بولے۔ آپ تو ادھر کا راستہ ہی بھول گئے۔

منشی جی۔ مہاراج! اب آپ کا اور میرا رشتہ دوسری قسم کا ہے۔ زیادہ آؤں جاؤں تو آپ ہی کہیں گے۔ اب یہ کیا کرنے آتے ہیں۔ شاید کچھ لینے کی نیت سے آتے ہوں گے۔ زندگی میں کبھی صاحب ثروت نہیں رہا۔ لیکن اپنے وقار کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

راجہ۔ آخر آپ دن بھر بیٹھے وہاں کیا کرتے ہیں؟ دل بھی نہیں گھبراتا؟ (مسکرا کر) سمدھن صاحبہ میں بھی تو اب وہ کشش نہیں رہی۔

منشی جی۔ واہ! آپ اس کشش کا مزہ کیا جانیں۔ میرا تو دعوےٰ ہے۔ کہ میاں بیوی کا رشتہ محبت عمر کے ساتھ ہی مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اب تو راج کمار کا تلک ہو جانا مناسب ہے۔ آپ بھی کچھ دن بھگوت بھجن کریجیے۔

راجہ۔ خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہے۔ کہ جب سے شنکھدھر آیا ہے مجھے نہ جانے کیوں یہ وہم ہوتا ہے کہ اس تقریب میں کوئی نہ کوئی خلل واقع ہوگا۔ دل کو بہت سمجھاتا ہوں۔ لیکن یہ اندیشہ دل سے دور نہیں ہوتا۔

منشی۔ آپ ایشور کا نام لے کر تلک کیجیے۔ جب ٹوٹی ہوئی آرزوئیں پوری ہو گئیں۔ تب سارے کام خیر و خوبی سے ہو جائیں گے۔ آج میرے یہاں محفل ہوگی۔ آپ کو بھی دعوت دیتا ہوں۔

راجہ۔ نہیں منشی جی۔ مجھے تو معاف کیجیے۔ میرے دل کو سکون نہیں ہے آپ سے سچ کہتا ہوں۔ آج اگر مجھے موت آجاتی تو مجھ سے زیادہ خوش نصیب آدمی دنیا میں نہ ہوگا۔ غم کی انتہا دیکھ لی۔ خوشی کی انتہا بھی دیکھ لی۔ اب

اور کچھ دیکھنے کی ہوس نہیں۔ ڈرتا ہوں۔ کہیں پلڑا پھر دوسری طرف نہ جھک جائے۔

منشی جی دیر تک بیٹھے راجہ صاحب کو تشفی دیتے رہے۔ پھر سب عورتوں کو اپنے یہاں آنے کا نیوتہ دے کر اور تشنکھ دھر کو گلے لگا کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اس بے لوث آدمی نے فکروں کو کبھی اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ دولت کی خواہش تھی، ثروت کی بھی خواہش تھی۔ پر اس پر جان نہ دیتے تھے۔ جمع کرنا تو سیکھا ہی نہ تھا۔ تھوڑا ملا تب بھی تنگی رہی۔ بہت ملا تب بھی تنگی رہی۔ تنگی سے آخر دم تک ان کا گلا نہ چھوٹا۔ ایک زمانہ تھا۔ جب اچھے کھانے کو ترستے تھے۔ اب دل کھول کر خیرات کرنے کو ترستے تھے۔ کیا پاؤں اور کیا دیدوں؟ بس فکر تھی تو اتنی ہی۔ کمر جھک گئی تھی۔ آنکھوں سے سوجھتا بھی کم تھا۔ لیکن محفل روزانہ جمتی تھی۔ دل میں کسی سے کینہ نہیں رکھنے اور نہ کبھی کسی کے بد خواہ ہوئے۔ شام کو منشی جی کے گھر بڑی دھوم دھام سے جشن ہوا۔ نرملا پوتے کو چھاتی سے لگا کر خوب روئی۔ اس کا جی چاہتا تھا۔ یہ میرے ہی گھر رہتا۔ اُسے دیکھنے سے آنکھوں کو سیری نہ ہوتی تھی اہلیا ہی کے باعث اُس کا لڑکا ہاتھ سے گیا۔ پوتا بھی اُسی کے کارن ہاتھ سے جا رہا ہے۔ اس لئے اب بھی اُس کا دل اہلیا سے نہ ملتا تھا۔ وہ اب اس آخر وقت میں کسی کو آنکھوں کے اوٹ نہ کرنا چاہتے تھے۔ نہ جانے کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ بیچاری کسی کو دیکھ بھی نہ سکے۔

باہر گانا ہو رہا تھا۔ منشی جی دعوت کا انتظام کر رہے تھے۔ اہلیا لالٹین لے کر گھر کے اثاثہ کا جائزہ لے رہی تھی اور دل میں اپنی چیزوں کے تہس نہس ہو جانے پر جھنجھلا رہی تھی۔ ادھر نرملا چارپائی پر لیٹی تشنکھ دھر کی باتیں

سننے میں محو تھی۔ کملا پانوں دبا رہی تھی۔ ششنکھدھر پنکھا جھل رہا تھا۔ کیا جنت میں اِس سے زیادہ دلچسپی کے سامان ہوں گے۔ اِس سُکھ سے اہلیا اُسے محروم کر رہی تھی۔ اس نے آکر اس کا گھر ملیامیٹ کر دیا۔

علے الصبح جب ششنکھدھر رخصت ہونے لگا تو نرملا نے کہا۔ بیٹا! اب بہت دن نہ جیونگی۔ جب تک جیتی ہوں۔ ایک بار ضرور آجایا کرو۔

منشی جی بولے۔ آخر سیر کرنے تو روز ہی نکلو گے۔ گھومتے ہوئے اِدھر بھی آجایا کرو۔ یہ مت سمجھو کہ یہاں آنے سے تمہارا وقت برباد ہوگا۔ بزرگوں کی دُعا اکارت نہیں جاتی۔ میرے پاس راج پاٹ نہیں ہے۔ پر ایسا کمال ہے کہ جو راج پاٹ سے کہیں بڑھکر ہے۔ بہت خدمت اور بڑے ریاض سے میں نے اِسے حاصل کیا ہے۔ وہ مجھ سے لے لو۔ اگر سال بھر بھی بلاناغہ مشق کرتے رہو تو بہت کچھ سیکھ سکتے ہو۔ اِسی علم کی بدولت تم نے پانچ سال میں کتنی ہی دیاروں کی سیاحت کی۔ کچھ دن اور مشق کرلو تو پارس ہوجاؤ۔

نرملا نے منشی جی کا منہ چڑھا کر کہا۔ بھلا رہنے دو اپنی ودیا۔ آئے وہاں سے بڑے ودوان بن کر۔ مجھے تمہاری ودیا نہیں چاہیئے۔ چاہے تو دُنیا بھر کے اُستادوں کو بلا کر پنچ لے۔ اُسے کمی کس چیز کی ہے۔؟

منشی۔ تم تو ہو بے وقوف! تم سے کوئی کیا کہے۔ اِس ودیا سے ایشور کے درشن تک ہوجاتے ہیں۔ تمہیں کچھ خبر بھی ہے؟ بڑے خوش نصیب ہیں وہ جنہیں یہ ودیا آتی ہے۔

نرملا۔ جبھی تو بڑے بھاگوان ہو!

منشی۔ تو اور کیا ابھاگا ہوں۔ جس کے ایسا فرشتہ خصال پوتا ہو۔ ایسی دیوی سی بہو ہو۔ مکان ہو۔ جایداد ہو۔ چار کو کھلا کر کھاتا ہو۔ کیا وہ ابھاگا

ہے؛ جس کی عزت آبرو سے نبھ جائے۔ وہی خوش نصیب ہے۔

آج راجہ صاحب کے یہاں بھی یہی تقریب تھی۔ اسلئے شنکھ دھر نہ ٹھہر سکا جب وہ موٹر پر بیٹھ گیا تو نرملا دروازے پر کھڑی ہو کر اُسے دیکھنے لگی بھگوان! شنکھدھر کے ساتھ ہی اُس کا دل بھی اڑا چلا جاتا تھا۔ جوانوں کی محبت میں اضطراب ہوتا ہے۔ بوڑھوں کی محبت میں درد۔ جوان جس سے محبت کرتا ہے اُس سے محبت کی اُمید بھی رکھتا ہے۔ اگر اس سے محبت کے بدلے محبت نہ ملے تو محبت کو دل سے نکال کر پھینک دے گا۔ بوڑھوں کو بھی کیا یہی اُمید ہوتی ہے؟ وہ محبت کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کے بدلے میں اُنہیں کچھ نہ ملے گا۔ یا ملے گا تو رحم۔ شنکھدھر کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے دل میں تڑپ نہ تھی۔ وہ یوں خوش خوش چلا جا رہا تھا۔ جیسے سیر کر کے لوٹا جا رہا ہو۔

مگر نرملا کا دل پھٹا جاتا تھا اور منشی بجر دھر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔

(۵۳)

کئی دن گذر گئے راجہ صاحب عبادت اور پرستش میں مصروف تھے ادھر چار پانچ سال سے انہوں نے کسی مندر کیطرف جھانکا نہ تھا۔ ریاست میں دھرم کا کھاتہ ہی توڑ دیا گیا تھا۔ مگر اب یکایک اُن کا اعتقاد جی اٹھا تھا۔ دھرم کھاتہ پھر کھل گیا۔ اور جو اوقاف بند کر دی گئی تھیں۔ وہ پھر جاری ہوئیں راجہ صاحب نے پھر چولا بدلا۔ وہ کسی کی بے غرض عبادت نہ کرتے تھے۔ جب اہلیا اور شنکھدھر نے آکر ان کی زندگی کو روشن کر دیا تو پھر پوجا پاٹھ، دان پن

کی اُنہیں دھن ہوئی۔

اِن دنوں راجہ صاحب اکثر تنہائی میں بیٹھے کسی فکر میں غرق رہتے تھے۔ باہر بہت کم نکلتے۔ کسی چیز سے رغبت نہ رہی تھی۔ اب اپنی زندگی کے کارنامے یاد کر کرکے ان کی تلافی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آدھی رات سے زیادہ بیت چکی تھی۔ رنواس میں سونا پڑا ہوا تھا۔ منورما اپنی چھوٹی کوٹھڑی میں پڑی ہوئی تھی۔ دفعتاً راجہ صاحب اندر داخل ہوئے منورما حیرت میں آکر کھڑی ہو گئی۔

راجہ صاحب نے کوٹھڑی کو نیچے سے اوپر تک دیکھ کر رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ نورا! میں آج تم سے اپنی خطائیں معاف کرانے آیا ہوں۔ مجھے اتنے دنوں تک کیا ہو گیا تھا۔ کہہ نہیں سکتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف دشمنوں سے گھرا ہوا ہوں۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے رہتے تھے۔ کسی پر یقین نہ آتا تھا۔ اب بھی مجھے کسی غیبی آفت کا خوف ہو رہا ہے تم میری حفاظت کے لئے جو کچھ کرتی تھیں۔ اُس میں مجھے دغا کی بو آتی تھی۔ تم نے مجھے ہوشیار رہنے کی تاکید کی تھی۔ لیکن میں نے اس کا مطلب کچھ اور ہی سمجھ لیا ؟

"منورما نے چشم پُرآب ہو کر کہا۔ اِن باتوں کی یاد نہ کیجیے۔ آپ کو بھی رنج ہوتا ہے اور مجھے بھی رنج ہوتا ہے۔ میرا ایشور جانتا ہے۔ کہ ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل میں بے وفائی کا خیال نہیں آیا۔

راجہ۔ جانتا ہوں۔ نورا! جانتا ہوں۔ آج مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ مصیبت میں دل کے نازک جذبات فنا ہو جاتے ہیں۔ ثروت پاکر مجھے جو کچھ کرنا چاہیے تھا۔ وہ کچھ نہ کیا۔ جو کچھ کیا اُلٹا ہی کیا۔ میں رانی دیوپریا کے طرز عمل پر ہنستا

کرتا تھا۔ پر میں نے رعایا پر جتنے ستم ڈھائے۔ انہیں دیکھ کر دیو پریا بھی کانوں پر ہاتھ رکھتی۔ میں فرض کو کالا سانپ سمجھتا تھا پر آج ریاست قرض کے بوجھ سے لدی ہوئی ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ مجھے یہ ریاست نہ ملی ہوتی۔ تو میری زندگی اس سے کہیں اچھی ہوتی۔

منورما۔ مجھے بھی اکثر یہی خیال ہوا کرتا ہے۔

راجہ۔ اب زندگی کے سب سے اونچے زینہ پر پہونچکر جب گذرے ہوئے زمانہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو افسوس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مجھ سے کسی کو فیض نہ پہونچا۔ میں زندگی کی اُن برکتوں سے بھی محروم رہا جو عوام کے حصّہ میں آتی ہیں۔ اگر میری زندگی میں کوئی میٹھی یاد ہے۔ تو وہ تمہاری ذات سے ہے اور وہ تمہارے ساتھ میں نے یہ برتاؤ کیا ہے شنکھدھر اپنے ساتھ میرے دل کی ساری نزاکتوں کو بھول گیا تھا۔ اُسے پاکر آج پھر میں اپنے کو پا گیا تھا۔ لیکن میرا دل اندر ہی اندر کانپ رہا ہے۔ میں اس خوف کو کسی طرح باہر نہیں نکال سکتا۔ کہ کوئی آفت آنے والی ہے۔ اس کا خیال کرکے ہی میں گھبرا جاتا ہوں۔ اور جی چاہتا ہے کہ زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ میں سونے کی گٹھڑی لئے خوفناک بیابان میں اکیلا چلا جا رہا ہوں۔ ہر قدم پر رہزنوں کا خوف دل میں لرزہ پیدا کرتا ہے۔

یہ کہتے کہتے راجہ صاحب منورما کے اور قریب چلے آئے اور اُس کے کان کے پاس منہ لے جاکر بولے۔ یہ خوف بالکل بے بنیاد نہیں ہے نورا! رانی دیو پریا کے شوہر میرے بھائی ہوتے تھے۔ ان کی صورت شنکھدھر سے بالکل ملتی ہے۔ جوانی میں میں نے ان کو دیکھا تھا ہو بہو یہی صورت تھی۔ انکی ایک تصویر میرے البم میں ہے۔ تم بھی کہوگی کہ یہ شنکھدھر ہی کی تصویر ہے

پہلے شنکھدھر کی صورت اُن سے اتنی ہی ملتی تھی۔ جتنی میری۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ہی آ گئے۔

منورما۔ تو اس میں خوف کی کیا بات ہے! اُسی شاخ کا پھل شنکھدھر بھی تو ہے۔

راجہ۔ نہیں نورا! تم یہ بات نہیں سمجھ رہی ہو۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ یہ بڑا اسرار معاملہ ہے۔ میں نے اب کی شنکھدھر کو دیکھا۔ تو چونک پڑا۔ اسی وقت میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

منورما۔ تعجب تو مجھے بھی ہو رہا ہے۔ بہن رام پریا ابھی کہہ رہی تھیں کہ بہو کی صورت رانی دیو پریا سے بالکل ملتی ہے۔ وہ تو بہو کو دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔

راجہ نے گھبرا کر کہا۔ رام پریا نے مجھ سے یہ بات نہیں کہی۔ نورا! اب خیریت نہیں ہے! میری بات گرہ باندھ لو۔ اب خیریت نہیں ہے!!

راجہ نے دونوں ہاتھوں سر پکڑ لیا۔ فکر میں ڈوب گئے۔ ایک لمحے کے بعد گویا دل میں یہ فیصلہ کر کے ایسی حالت میں انہیں کیا کرنا ہوگا۔ نہایت درد ناک لہجہ میں منورما سے بولے۔ کیوں نورا! ایک بات تم سے پوچھوں بُرا تو نہ مانو گی۔؟ میرے دل میں کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے مجھ سے کیوں شادی کی۔؟ اس وقت بھی میری عمر ڈھل چکی تھی۔ ثروت کی خواہش تمہیں کبھی نہیں رہی۔ کیا یہ محض غیبی تحریک تھی؟ جس کے ذریعہ مجھے اچھے کاموں کا صلہ دیا گیا۔

منورما نے مسکرا کر کہا۔ بڑے کاموں کی سزا کہیئے۔

راجہ۔ نہیں نورا! میں نے زندگی میں جو کچھ راحت اور لذت پائی۔ وہ

تم میں پائی ہے۔ یہ تقدیر کی نیرنگی ہے۔ کہ تمہیں میرے ہاتھوں اتنی ایذا پہونچے۔ مگر وہ امتحان تھا جس نے تمہاری وفا اور خلوص کو اور بھی روشن کر دیا۔ کوئی دوسری عورت ایسی حالت میں میری خون کی پیاسی ہو جاتی۔ وہ روحانی کوفت۔ وہ تحقیر وہ سفلہ پن دوسرا کون سہتا اور سہکر دل میں میل نہ آنے دیتا۔ اس کا صلہ میں کیا دے سکتا ہوں۔

منورما۔ عورت کیا صلہ ہی کے لئے شوہر کی خدمت کرتی ہے۔

راجہ۔ اس مسئلہ پر میری زبان نہ کھلواؤ۔ نورا! کہیں شاید تمہیں میرے منہ سے اپنی بہنوں کے متعلق ناگوار حقیقتیں سُننی پڑیں۔ میرے اُس سوال کا جواب دو جو میں نے ابھی تم سے کیا تھا۔ مجھ میں وہ کونسی بات تھی جس نے تمہیں مجھ سے شادی کرنے کی تحریک کی۔ منورما! بتادوں۔ آپ ہنسئے گا تو نہیں۔ میں رانی بننا چاہتی تھی۔

راجہ۔ رانی کس لئے بننا چاہتی تھی۔؟

منورما۔ جس لئے آپ راجہ بننا چاہتے تھے۔ نام اور نمود۔ خدمت اور اصلاح میری نظروں میں بھی ثروت کی نعمتیں ہیں۔

راجہ۔ لیکن میں تو عیش اور حکومت کے لئے راجہ بننا چاہتا تھا۔ تمہارا معیار کچھ اور ہے۔ میرا کچھ اور۔ اب میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ کون جانتا ہے کیا ہونے والا ہے۔ تم نے خدمت کے لئے زندگی کے اور سبھی مسرتوں کو قربان کر دیا۔ اس لئے میں کوئی ایسا انتظام کر جانا چاہتا ہوں جس میں تمہیں آگے چل کر کوئی دقت نہ اٹھانی پڑے۔ میں چاہتا ہوں کہ ریاست کا ایک حصہ تمہارے نام لکھ دوں۔ میری بات سُن لو نورا! میں نے دُنیا دیکھی ہے اور دُنیا کا بیوہار جانتا ہوں۔ اس میں نہ میرا کچھ نقصان ہے نہ

تمہارا شنکھدھر کا۔ نہیں اس کا اختیار ہوگا۔ کہ جب مرضی ہوا پنا حصہ شنکھدھر کو دے دو۔ لیکن ایک حصہ پر تمہارا نام ہونا ضروری ہے۔ میں کوئی عذر نہ سنوں گا۔

منورما۔ میری نجات اب اسی میں ہے کہ آپ کی خدمت کرتی رہوں۔

راجہ۔ تم اب بھی میری باتیں نہیں سمجھیں۔ مجھے آثار برے نظر آ رہے ہیں۔

منورما۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے شکوک باطل ہیں۔ لیکن ایشور کو برا کرنا ہی منظور ہو تو بھی میں شنکھدھر کی ہمسری نہ کروں گی۔ جسے میں نے لڑکے کی طرح پالا ہے۔

راجہ نے زانو پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔ نورا! تم اب بھی نہیں سمجھیں۔ خیر کل سے تم نئے محل میں رہوگی۔ یہ میرا حکم ہے۔

راجہ صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بجلی کی شفاف روشنی میں منورما انکی تنتی ہوئی صورت کو کھڑی دیکھتی رہی۔ غرور سے اُس کا دل پھولا نہ سماتا تھا اس بات کا غرور نہ تھا کہ اب ریاست میں پھر اُس کی طوطی بولے گی۔ اُسے پھر سیاہ و سفید کا اختیار ہوگا۔ غرور اس بات کا تھا کہ وہ امتحان میں پوری اُتری۔ آج ابشال سنگھ نے منورما کے دِل پر آخری فتح پائی۔ ان کی ہوا روی نے منورما کو جیت لیا۔ محبت ہمدردی ہی کی رنگین صورت ہے۔

(۵۴)

راجہ صاحب کو اب کسی طرف اطمینان نہ تھا۔ ایک نامعلوم دہشت ہمیشہ اُن پر غالب رہتی۔ دو چار آدمیوں کو زور زور سے باتیں کرتے سُنتے انہیں کسی حادثہ کا گمان ہو جاتا تھا۔ شنکھدھر کہیں جاتا۔ تو جب تک وہ خیریت سے لوٹ نہ آتے

اُنہیں اضطراب رہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی راتوں کو اُٹھ کر ٹھاکر دوارہ میں چلے جاتے تھے۔ اور گھنٹوں ایشور کی استُتی کرتے۔ شنکھدھر کا چہرہ دیکھتے ہی ان کی آنکھیں پُرآب ہو جاتی تھیں۔ جو خوف انکے دِل میں سمایا ہوا تھا۔ وہ ظاہر نہ کر سکتے تھے۔ شاید اس کی حقیقت سے بے خبر تھے۔

شام ہو گئی تھی۔ راجہ صاحب نے موٹر منگوائی۔ اور منشی بجردھر کے مکان پر جا پہونچے۔ منشی جی کی مجلس آراستہ ہو گئی تھی۔ ان کی ساری فکریں ساری پریشانیاں نغمہ کی تانوں میں روپوش ہو جاتی تھیں۔ راجہ صاحب کو دیکھتے ہی بولے۔ آئیے مہاراج! آج گوالیار کے ایک استاد کا گانا سناؤں یہ اِس زمانہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

راجہ صاحب دِل میں منشی جی کی رنگین مزاجی پر جھنجھلائے۔ دُنیا میں ایسے مخلوق بھی ہیں۔ جنہیں اپنے عیش کے سامنے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ شنکھدھر سے میرا ان کا یکساں تعلق ہے۔ مگر یہ اپنے گانے بجانے میں مست ہیں میں تفکرات کا شکار ہو رہا ہوں۔ بولے۔ اِسی لئے تو آیا ہی ہوں۔ لیکن ذرا آپ سے تخلیہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

دونوں آدمی الگ ایک کمرہ میں جا بیٹھے۔ راجہ صاحب سوچنے لگے کسطرح بات چیت شروع کروں منشی جی نے ان کا رُخ دیکھ کر کہا۔ میرے لایق جو خدمت ہو فرمائیے۔ آپ بہت متفکر معلوم ہوتے ہیں۔

راجہ۔ مجھے آپ کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ آپ مجھے بھی یہ فن کیوں نہیں سکھا دیتے۔

منشی۔ یہ تو کوئی مشکل نہیں۔ اِتنا ہی سمجھ لیجئے۔ کہ ایشور نے ہی کائنات کو پیدا کیا۔ اور وہی اِسے چلاتا ہے۔ جو کچھ اُسکی مرضی ہوگی۔ وہی ہوگا۔ اِس کی فکر

کا بوجھ ہم کیوں اپنے سر لیں ؟

راجہ۔ یہ تو بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ مگر اس سے دل کو اطمینان نہیں ہوتا اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ دنیا پرستی ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ میں نے اپنی زندگی پر کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کیا۔ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ کبھی اس کا دھیان ہی نہ کیا۔ جب راج نہ تھا۔ تو کچھ دنوں کے لئے خدمت کا خیال دل میں پیدا ہوا تھا۔ راج ملتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ شنکھدھر کو پاکر میں نہال ہو گیا تھا۔ لیکن اب کی جب سے وہ لوٹا ہے۔ اس کی طرف سے ایک عجیب فکر پیدا ہو گئی ہے۔

منشی۔ جی نہیں! ان دنوں تو میں ہاہر نوکر تھا۔ تب علم کی قدر رکھتی۔ مڈل پاس کرتے ہی سرکاری نوکری مل گئی۔

میرے بڑے پنڈت جی کہا کرتے تھے یہ لڑکا ایک دن اعلیٰ منصب پر پہونچے گا۔ ان کی پیشین گوئی اُس دن پوری ہوئی جب میں تحصیلداری پر پہونچا۔

راجہ۔ بھائی صاحب کی صورت آج تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے یہ دیکھئے ان کی تصویر ہے۔

راجہ صاحب نے ایک فوٹو نکال کر منشی جی کو دکھلایا منشی جی اُسے دیکھتے ہی بولے۔ یہ تو شنکھدھر کی تصویر ہے۔

راجہ۔ نہیں صاحب! یہ تو میرے بڑے بھائی کی تصویر ہے شنکھدھر نے تو ابھی تصویر ہی نہیں کھچوائی۔

منشی۔ میں اسے کیسے مان لوں یہ تصویر صاف شنکھدھر کی ہے۔

راجہ۔ تو تحقیق ہو گیا کہ میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا رہی تھیں۔

منشی۔ کیا یہ فی الواقعی آپکے بھائی صاحب کی تصویر ہے۔ ؟

راجہ۔ جی ہاں! یقین مانیئے۔

منشی۔ یہ معمہ سمجھ میں نہیں آتا۔

راجہ۔ اب آپ سے کیا عرض کروں۔ دو صورتوں میں اتنی مشابہت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ یہ فکر مجھے مارے ڈالتی ہے۔ بھائی صاحب نے ہی پھر میرے گھر میں اوتار لیا ہے۔ اس میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں۔ ایشور ہی جانے کیوں ایشور نے یہ عنایت کی ہے۔

منشی۔ ایشور چاہیں گے تو سب خیریت ہوگی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔

راجہ۔ اگر ایشور کو خیریت منظور ہوتی۔ تو یہ صورت ہی کیوں پیدا ہوتی۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی کرشمہ دکھائیں گے۔ بہو کی صورت بھی رانی دیو پریا سے مل رہی ہے۔ رام پریا تو بہو جی کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اُسے یقین ہے کہ دیو پریا ہی نے اوتار لیا ہے۔ بھائی اور بھاوج کا پھر اس گھر میں آنا اپنے اندر کوئی معنے رکھتا ہے۔

منشی جی نے اب کی کچھ متفکر ہو کر کہا۔ یہ تو عجیب راز ہے۔

راجہ۔ عجیب نہیں ہے منشی جی! یہ ریاست فنا ہونے والی ہے لیکن آپ دیکھ لیجئے گا۔ میں اپنے کو تقدیر کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بننے دوں گا۔ اگر میں نے بڑے کام کئے ہیں تو مجھے جو سزا چاہے دو۔ اندھا کر دو۔ میرا ایک ایک عضو گل گل کر گر پڑے۔ دانہ دانہ کو محتاج ہو جاؤں۔ مجھے یہ سب منظور ہے لیکن شنکھدھر کے سر میں درد بھی ہو۔ یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔

منشی۔ آپ نے کسی جوتشی سے اس معاملہ میں صلاح نہیں لی۔

راجہ۔ جی نہیں! کسی سے نہیں۔ جو بات صریح دیکھ رہا ہوں اُسے

کسی سے کیا پوچھوں۔ کوئی کفارہ اِس بلا کو رد نہیں کرسکتا۔ کفارہ سے مشیت میں تغیر نہیں ہوسکتا۔ دفعیات کی حقیقت خوب سمجھتا ہوں منشی جی! لیکن کچھ بھی ہو۔ میں تقدیر کی کٹھ پتلی نہ بنوں گا۔ میں اُسے کچل دوں گا۔ جیسے کوئی زہریلے سانپ کو کچل دیتا ہے۔ اپنی تباہی اپنی آنکھوں دیکھنے سے قلق ہوتا ہے میں اُس مکارہ کو یہ موقع نہ دوں گا۔ وہ مجھے رلا کر آپ ہنسے۔ میں آج دُنیا کے سب سے خوش نصیب آدمیوں میں سے ہوں۔ اسی حالت میں دُنیا سے رخصت ہوجاؤں گا۔ میرے بعد میری تعمیر کا کیا حشر ہوگا۔ اُس کا مجھے غم نہیں۔ مجھے تعجب تو یہ ہے کہ اِس حالت میں بھی آپ نغمہ کا لُطف کیونکر اٹھا سکتے ہیں۔

منشی جی نے عالمانہ انداز سے کہا۔ میں اپنی زندگی میں کبھی نہیں رویا۔ ایشور نے جس حالت میں رکھا۔ اُسی میں خوش رہا۔ فاقے بھی کیے ہیں اور آج خدا کے فضل سے دس کو کھلا کر کھاتا ہوں۔ پر رہا ایک ہی رس۔ نہ ساتھ کچھ لایا ہوں نہ لے جاؤں گا۔ فضول کیوں روؤں۔

راجہ۔ آپ ایشور کو رحیم سمجھتے ہیں؟ رحم اُسے چھو بھی نہیں گیا۔

منشی۔ میرا تو ایسا خیال نہیں ہے۔

راجہ۔ یہ آپ کی غلطی ہے۔ وہ انتہا درجہ کا ظالم بے رحم اور مکار ہے۔ جسے اپنے ہی بنائے ہوئے مخلوق کو ستانے میں مزہ آتا ہے۔ جو اپنے بچوں کے بنائے ہوئے گھروندے روندتا پھرتا ہے۔ آپ اُسے رحیم کہیں۔ سنسار اُسے رحیم کہے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ اگر میرے ہاتھوں میں قوت ہوتی تو میں اس کا یہ سارا نظام اُلٹ پلٹ دیتا۔ اسمیں دُنیا کو پیدا کرنے کی قوت ہے۔ اُسے چلانے کی نہیں۔

راجہ صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے تشویشناک لہجہ میں بولے

جو بات پوچھنے آیا تھا۔ وہ تو بھول ہی گیا۔ آپ نے سادھو سنتوں کی بہت خدمت کی ہے۔ مرنے کے بعد روح کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہوتی؟

منشی۔ سنا تو یہی ہے کہ ہوتی ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ جتنی قید حیات میں۔

راجہ۔ جھوٹی بات ہے۔ بالکل جھوٹی۔ یقین نہیں آتا۔ اس دنیا کے سکھ دکھ اور ہی قسم کے ہونگے۔ میں تو سمجھتا ہوں کسی بات کی یاد ہی نہ رہتی ہوگی۔ جنت و دوزخ یہ سب دنیا داروں کے گورکھ دھندے ہیں۔ میں ان میں نہ پڑوں گا۔ اپنے تئیں ایشور کے رحم اور قہر کے دھوکے میں نہ ڈالوں گا۔ میرے بعد جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہوگا ہی۔ آپ سے اتنا ہی کہنا ہے کہ اہلیا کو تسلی دیتے رہیے گا۔ منورما کیطرف سے میں بیفکر ہوں۔ وہ ہر ایک حالت میں مستقل رہ سکتی ہے۔ اہلیا اُس بجلی کی چوٹ نہ سہ سکے گی۔

منشی جی نے مضطرب ہوکر راجہ صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور باچشم تر بولے آپ اتنے مایوس کیوں ہو رہے ہیں۔ ایشور پر توکل رکھئے۔ سب خیریت ہوگی۔

راجہ۔ کیا کروں۔ میرا دل آپ کا سا نہیں ہے۔ شنکھدھر کی صورت دیکھ کر میرا خون سرد ہو جاتا ہے۔ وہ میرا نواسا نہیں، دشمن ہے۔ اس سے کہیں اچھا ہوتا کہ میں بے اولاد رہتا۔

راجہ صاحب دروازہ کیطرف چلے۔ منشی جی بھی اُن کے ساتھ موٹر تک آئے۔ راجہ صاحب کے ان صبر شکن الفاظ نے ان کے حواس مختل کر دیئے تھے بیکس نظروں سے راجہ صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔ گویا جاں بخشی کی التجا کر رہے ہوں۔

راجہ نے موٹر پر بیٹھ کر کہا۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں نے جو التجا کی

ہے۔ اُس کا خیال رکھے گا۔

منشی جی صورت تصویر کھڑے رہے۔ موٹر چلی گئی۔

(۵۵)

شنکھدھر زاہد صفت شاہزادہ ہے۔ عیش کی کسی چیز کی طرف اُس کی طبیعت مائل نہیں۔ دوسروں سے وہ بہت شفقت اور محبت سے پیش آتا ہے۔ اہلیا اور منورما کے پاس وہ گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ دادا اور دادی کے پاس جاکر اُس کے قہقہوں کی پٹاری سی کھل جاتی ہے۔ لیکن سیر و شکار سے ذرا بھی ملتفت نہیں ہوتا۔ گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہوا وہ ہمیشہ کسی گہرے خیال میں محو رہتا ہے۔ اس کے جی میں بار بار آتا ہے کہ باپ کے پاس چلا جائے۔ مگر گھر والوں کے رنج و غم کے خوف سے جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ جب اُس کے باپ نے راہ حق میں اپنے کو قربان کر دیا ہے۔ تو وہ کس دل سے دُنیا کی لذتوں کا لُطف اٹھائے۔ نرم تکئے اس کے جسم میں کانٹوں کی طرح چُبھتے ہیں۔ لذیذ کھانے اُسے زہر کی طرح لگتے ہیں۔

پر سب سے پُراسرار پہلو یہ ہے کہ وہ کملا سے مطلق ملتفت نہیں ہوتا۔ حُسن و شباب کی رانی کملا وہ تقوے و طہارت کی رانی کملا نہیں ہے شباب اپنے ساتھ شباب کی اُمنگیں بھی لایا ہے۔ وہ نت نئے روپ بدل کر شنکھدھر کے پاس جاتی ہے۔ پر عین اُسی وقت شنکھدھر کو کسی اشد ضرورت سے باہر جانا پڑتا ہے، یا کوئی علمی اور مذہبی بحث چھڑ جاتی ہے۔ راتوں کو بھی شنکھدھر مطالعہ یا تصنیف میں غرق رہتا ہے۔ کملا اس کے پاس بار بار آتی ہے اور دعوتِ حُسن دیکر لوٹ جاتی ہے۔ اُسے دورِ ماضی کی ساری داستان یاد ہے

پروہ اِس قصّے کو بھول جانا چاہتی ہے۔ اُس سے اُسے رنج ہوتا ہے۔

نصف شب گذر چکی ہے۔ فطرت مترنم خموشی میں ڈوبی ہوئی ہے چاروں طرف سنہری چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ درختوں کے نیچے کتنا خوبصورت جال بچھا ہوا ہے۔ ندیوں میں کیسی دلاویز گلکاریاں ہو رہی ہیں۔ کائناتِ حُسن کے نغمہ میں سرشار ہے۔

رانی کملا نے آج اپنے مرصع زیورات اُتار دیئے ہیں۔ گیسوئے عنبریں کھول دیئے ہیں اور جوگنی کے روپ میں پریم کی بھیکھ مانگنے جا رہی ہے آرائشوں سے بے نیاز ہو کر اُس کا حُسن چاند کے سادہ حُسن کی طرح چمک اُٹھا ہے۔ وہ آئینہ کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ آئینہ جگمگا اٹھا۔ کمرہ سے باہر نکلی۔

دفعتاً اُس کے دِل کی گہرائیوں میں کہیں سے آواز آئی، خبردار!

اُس کے پاؤں رُک گئے۔ اُس نے سہمی ہوئی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر آگے بڑھی۔

ہوا تیز ہو گئی۔ کمرہ میں کوئی چیز کھٹ کھٹ کرتی ہوئی زمین پر گر پڑی کملا نے کمرہ میں جا کر دیکھا۔ شنکھدھر کی روغنی تصویر سنگ مرمر کے فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی تھی۔ کملا کے عضو مفلوج سے ہو گئے۔ فضائے دِل میں ایک طوفانی تلاطم ہو رہا تھا۔ ایک لمحہ تک وہ دم بخود کھڑی رہی۔ پھر آگے بڑھی۔

شنکھدھر دیوان خانہ میں بیٹھا محوِ خیال تھا۔ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کا راز کیا ہے؟ میری زندگی اوروں سے مختلف کیوں ہے؟ کیا اسی لیے کہ مجھے جو علمِ غیب ہے اِس سے دوسرے محروم ہیں۔ اسی لئے کہ میں

دوسروں کے مرگ وحیات کے دور سے بے خبر ہوں؟ کیا ہر خاص و عام کے لئے یہ دور مقرر ہیں۔ اِس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔؟

کملا دروازہ پر آکر کھڑی ہوگئی۔

ششنکھدھر اُس کا فطری حسن دیکھ کر وجد میں آگیا۔ اب تک اُس نے اُس کا آرائشی حسن دیکھا تھا۔

کملا نے پوچھا اندر آؤں۔؟

ششنکھدھر کے دل کی گہرائیوں میں کہیں سے آواز آئی "خبردار! اُسکا چہرہ زرد ہوگیا۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

کملا نے پھر پوچھا۔ اندر آؤں؟

ششنکھدھر از خود رفتہ ہوگیا۔ فضائے دل میں گونجتی ہوئی وہ صدا طوفانی تلاطم میں غرق ہوگئی۔

وہ بولا۔ نیکی اور پوچھ پوچھ!

کملا کے پاؤں ٹھٹھک گئے۔ مگر ششنکھدھر بے خودی کے عالم میں کمرہ سے نکلا، اور کملا کے ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اسی وقت ہوا تند ہوگئی۔ بجلی کی روشنی ٹھنڈی ہوگئی۔ کمرہ میں تاریکی مسلط ہوگئی۔

کملا پنجہ صیاد میں پھنسے ہوئے طائر کی طرح اکھڑی ہوئی آواز میں بولی "مجھے چھوڑ دو۔ اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ششنکھدھر نے اُسے آغوش میں کھینچتے ہوئے کہا۔ گھر آئی لکشمی کو کون چھوڑتا ہے۔

کملا پر بھی بے خودی طاری ہوگئی۔ بولی! میں خود نہ آتی تو تم التفات بھی نہ کرتے۔

ششنکھدھر نے بجلی کا بٹن دبا کر کہا۔ لکشمی بغیر بلائے نہیں آتی کملا۔

کبھی نہیں۔ عاشق کے دل سے ہمیشہ تمناؤں کی صدا نکلتی رہتی ہے۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہے۔ پر اس کے روئیں روئیں سے التجا نکلتی رہتی ہے۔

کملا کا فرقت نصیب دل بے تاب ہو گیا۔ ہجر ازل سے تڑپتی ہوئی حسرتیں شمع کے دم آخر کی طرح چمک اٹھیں۔ اس نے اپنا سر شنکھدھر کے سینہ پر رکھ دیا۔ اور اسکے گلے کو بانہوں سے گویا ہمیشہ کے لئے باندھ لیا۔

شنکھدھر کو ایسا معلوم ہوا کہ زمین نیچے کھسکی جاتی ہے اور آسمان اوپر اڑا جاتا ہے۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ اس کے سر پر ایک بجلی سی گر رہی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

کملا کے منہ سے ایک جانسوز آہ نکل گئی۔ کیسی عارضی بہار تھی۔ اس نے شنکھدھر کے زرد منہ کی طرف پُر خوف آنکھوں سے دیکھا۔ چراغ کی روشنی ماند ہو رہی تھی۔ گھبرا کر بولی "پیارے! تمہیں کیا ہو گیا؟ ہائے! تم یہ کیسے ہوئے جاتے ہو! ذرا آنکھیں کھول دو۔ دیکھو تمہاری کملا رو رہی ہے۔

شنکھدھر نے آنکھیں کھولیں۔ ان میں ناقابل بیان درد تھا۔ ناقابل برداشت غم اور ناقابل اظہار تشنگی! اس نے پُر حسرت لہجہ میں کہا۔ دیوی! رخصت! ہم پھر اپنی آرزوئیں لئے جدا ہوتے ہیں۔ ہم آزمائش میں پھر ناکام رہے۔ مرگ و زیست کے یہ دور اس وقت تک چلتے رہیں گے۔ جب تک محبت نفس کی آلائشوں سے پاک نہ ہو گی۔ ہر انسانی وجود کسی نہ کسی غیبی مشیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہماری زندگی اسی آزمائش کے لئے مخصوص ہے ۞

چاندنی اب بھی چھٹکی ہوئی تھی۔ درختوں کے نیچے اب بھی چاندنی کا جال بچھا تھا۔ لہروں پر اب بھی چاندنی ناچ رہی تھی۔ مگر رانی کملا کے لئے دُنیا تاریک تھی، بے حیات۔

دفعتاً راجہ بشال سنگھ آکر دروازہ پر کھڑے ہو گئے۔

رانی کملا ماتم کر رہی تھی۔ وہ ماتم جس کا یہ تیسرا دور تھا۔ اس کی شہرت اور تلخی اور جنون کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

راجہ صاحب یہ صدائے درد سنتے ہی گویا ندی میں پھسل پڑے۔ ایک ہاتھ سینہ پر تھا۔ آنکھیں پھیلی ہوئیں، ہونٹ کھلے ہوئے۔ گویا جان کے نکلنے کا دروازہ کھول دیا گیا ہو۔

انہوں نے ہونہار کو زیر کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ہونہار نے انہیں خاک میں ملا دیا۔ وہ ہونہار کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بننا چاہتے تھے۔ ہونہار نے دکھا دیا تم مٹی کے کھلونے ہو۔ جس چوٹ سے بچنے کے لئے وہ موت کے دامن میں چھپنے جا رہے تھے۔ وہ چوٹ برقی تندی اور تیزی سے انکے سر پر پڑ گئی۔ آج ہی وہ منشی بجر دھر کے پاس سے دل کے پھپھولے پھوڑ کر لوٹے تھے مگر قبل اسکے کہ وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کریں، غیب نے اُن کی آرزوں کا خاتمہ کر دیا۔

ایک لمحہ کے سکوت کے بعد راجہ صاحب کو ہوش آیا۔ کمرہ میں جاکر شنکھدھر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان کی زندگی کا چراغ بجھا ہوا پڑا تھا۔ آج سے پچاس سال قبل انہوں نے انہیں آنکھوں سے یہی نظارہ دیکھا تھا۔ یہی شنکھدھر تھا۔ ہاں یہی شنکھدھر تھا۔ یہی کملا تھی۔ یہی سب کچھ تھا۔ اس وقت دل کی خواہشیں بھری ہوئی تھیں۔ آج وہ خواہشیں فنا ہو گئی تھیں ٭

اُن کی زبان سے ماتم کا ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ گری۔ کھڑے کھڑے زمین پر گر پڑے اور زندگی کا پردہ گر گیا۔

(۵۶)

شنکھدھر کے چلے آنے کے بعد چکردھر کو یہ عالم ویران نظر آنے لگا۔ خدمت کا وہ جوش ختم ہو گیا۔ اُسی خوش رو نوجوان کی صورت آنکھوں میں پھرا کرتی۔ کھانا کھانے بیٹھتے تو اس کی جگہ خالی دیکھ کر ان کے حلق میں لقمہ نہ جاتا۔ ہر وقت کچھ کھوئے سے رہتے۔ بار بار یہی جی چاہتا کہ اُس کے پاس چلا جاؤں۔ شنکھدھر جس کمبل پر سوتا تھا۔ اُسے روز جھاڑ پونچھ کر تہ کر کے رکھ دیتے ہیں گویا وہ آنے والا ہے۔ صرف چند دنوں کے لئے چلا گیا ہے۔ شنکھدھر اپنی کھنجری چھوڑ گیا ہے۔ وہ بڑی حفاظت سے رکھی ہوئی ہے۔ کوئی اُسے چھونے نہیں پاتا۔ یہاں تک کہ چکردھر کے پرانے کرتے اور پھٹی ہوئی دھوتیاں بھی دُھلا کر رکھ دی گئی ہیں۔

شام ہو گئی ہے۔ چکردھر رخصتی کی تیاری کر رہے ہیں۔ اب یہاں نہیں رہا جاتا۔ اُس نوجوان کے دیدار کا اشتیاق اب روکے نہیں رُکتا۔

گاؤں کے چودھری نے آ کر کہا۔ مہاراج آپ فضول گٹھڑی باندھ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کی محبت آپ کو راستے سے کھینچ لائے گی۔ آپ ہماری عرض نہ سنیں۔ لیکن پریم کی رسی کو کیسے تڑا لیجئے گا۔

چودھری کا چھوٹا بچہ نیچے رکھی ہوئی کھنجری اُٹھا کر بجانے لگا۔ چکردھر نے اُس کے ہاتھ سے کھنجری چھینتے ہوئے کہا۔ ہمیں دے دو بیٹا۔ چھوٹ جائے گی۔

لڑکے نے رو کر کہا۔ ہم کھنجری لیں گے۔

چودھری نے چکردھر کی طرف دیکھ کر کہا، بابا جی کے چرن چھو کے تو دلا دوں۔

چکردھر بولے۔ نہیں بھائی یہ کھنجری اسی لڑکے کی ہے جو کتنے دنوں میرے پاس رہا تھا۔ دوسرے کی چیز کیسے دے دوں۔

گاؤں کے بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ چکردھر رو کر اور رُلا کر رخصت ہو گئے۔

لیکن دوسرے دن علی الصبح جب لوگ مندر میں پوجا کرنے آئے تو دیکھا بابا بھگوان داس چبوترے پر جھاڑو لگا رہے ہیں۔ ایک آدمی نے کہا۔ ہم کہتے تھے مہاراج نہ جائیے۔ آخر ہماری بھگتی آپ کو کھینچ لائی نہ۔ اب اسی گاؤں میں آپ کو کٹی بنانی پڑے گی۔

چکردھر نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ابھی کچھ دن یہاں اور دانہ پانی ہے بھائی۔

چکردھر نے دل میں ارادہ کیا۔ اب شنکھدھر کا خیال دل میں نہ لاؤں گا۔ وہ اپنے گھر پہونچ گیا ہو۔ ممکن ہے اس کا ناک بھی ہو گیا ہو۔ اب اسے میری یاد بھی نہ آتی ہو گی۔ میں فضول اس کے لئے اتنا پریشان ہوں۔

پھر سوچا ایک بار دیکھ آنے میں حرج ہی کیا ہے۔ کوئی مجھے باندھ تو رکھے گا نہیں۔ ذرا دیکھوں کس شان سے راج کرتا ہے۔ میری نصیحتوں کا کچھ اثر ہوا یا نہیں۔ دُھن کا پکا تو ہے۔ مگر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ انسان ایک معمہ ہے۔ مجھے دیکھ کر شاید جھیپے۔ مگر میں اس کے پاس جاؤں ہی کیوں دور ہی سے دیکھ کر کیوں نہ چلا آؤں۔

یہی سوچتے سوچتے چکردھر سو گئے۔ رات کو انہیں ایک ہولناک خواب نظر آیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ششانکھدھر ندی کے کنارے اُن کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ دفعتاً دُور سے ایک کشتی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس میں سے مناسنگھ اتر پڑا۔ اُس نے ہنس کر کہا۔ بابو جی یہی راجکمار ہے نہ؟ میں بہت دنوں سے انہیں تلاش کر رہا ہوں۔ راجہ صاحب انہیں بلا رہے ہیں۔ ششانکھدھر اُٹھ کر مناسنگھ کے ساتھ چلا۔ دونوں کشتی پر بیٹھے۔ مناسنگھ ڈانڈ چلانے لگا۔ ششانکھدھر نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر انہیں بلایا۔ وہ دوڑے۔ پر کشتی ڈوب گئی۔ ایک لمحہ میں کشتی اوپر آ گئی۔ مناسنگھ سابق کی طرح ڈانڈ چلا رہا تھا۔ مگر ششانکھدھر کا پتہ نہ تھا۔

چکردھر زور سے چیخ مار کر جاگ اُٹھے۔ اُن کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

ایشور! یہ خواب ہے یا شدنی!

اسی وقت اُٹھ بیٹھے۔ بقچہ اٹھایا اور چل کھڑے ہوئے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کی قطاریں گورِ غریباں کی طرح سنسان تھیں۔ چکردھر قدم بڑھائے ہوئے پتھریلی پگ ڈنڈیوں پر چلے جا رہے تھے۔ ان کی وہ حالت تھی جب اپنے کو اپنی خبر نہیں ہوتی۔ وہ ساری رات پتھریلے راستہ پر چلتے رہے۔ صبح ریلوے سٹیشن ملا۔ گاڑی آئی۔ اس پر جا بیٹھے۔ گاڑی میں کون لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چکردھر کو دیکھ کر وہ آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے۔ ان سے کیسے کیسے سوالات کر رہے تھے، اُن سوالات کا وہ کیا جواب دیتے تھے۔ راستہ میں کون کون سٹیشن ملے، کب دوپہر، کب شام، ان کیفیات کی انہیں بالکل خبر نہ تھی۔ مگر وہ کر وہی رہے تھے۔ جو انہیں کرنا چاہئے تھا۔ کسی بات کا اُلٹا پلٹا جواب نہ دیتے تھے۔ جن گاڑیوں

پر نہ بیٹھنا چاہتے تھے۔ اُن پر نہ بیٹھتے تھے۔ جن سٹیشنوں پر نہ اُترنا چاہتے۔ وہاں نہ اُترتے تھے۔ عادت اکثر ہوش کی قائم مقام ہو جایا کرتی ہے۔

تیسرے دن سویرے گاڑی کاشی جا پہونچی۔ جونہی گاڑی گنگا کے پُل پر پہونچی، چکردھر جیسے ہوش میں آگئے۔ سنبھل بیٹھے۔ گنگا کے بائیں کنارے پر ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ دوسری طرف کاشی کی سر بفلک عمارتیں، مندروں کے کلس اور مسجدوں کے مینار نستعلیق تحریر کی طرح اپنی موزوں پستی و بلندی کے ساتھ شفق صبح میں منقوش تھے۔ وسط میں گنگا کا حاشیہ تھا، آفتاب کی گلکاریوں سے مرصّع۔ آج بہت دنوں کے بعد یہ دلآویز منظر دیکھ کر، چکردھر کے دل میں عقیدت کا ایک دریا موجزن ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے وہ اپنے سارے تفکرات بھول گئے۔ بچپن کا ماضی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ جب اُنہیں گھاٹوں پر کھیلتے تھے۔ گنگا کی گود میں غوطے لگاتے تھے۔ خوش فعلیاں کرتے تھے۔ ایک بار اِس رسم کہن کو تازہ کرنے کا اشتیاق پیدا کیا۔ شاید اِس گود میں وہ سکون ملے۔ جس کے لئے روح تڑپ رہی تھی۔

سٹیشن پر کئی پرانے احباب سے ملاقات ہو گئی۔ ان کی صورتیں کتنی تبدیل ہو گئی تھیں۔ وہ چکردھر کو دیکھ کر چونکے۔ خیریت پوچھی اور چلے گئے۔ چکردھر نے دِل میں کہا کتنے رُوکھے لوگ ہیں۔ کسی کو دو چار باتیں کرنے کی بھی فرصت نہیں۔

وہ گنگا اشنان کرنے چلے گئے۔ راستہ میں گروسیوک سنگھ موٹر پہ سامنے سے آتے دکھائی دیئے۔ موٹر روک کر پوچھا۔ کیا ابھی آرہے ہیں؟

"جی ہاں۔ چلا ہی آتا ہوں"

گرسیوک نے فوراً موٹر بڑھا دی۔ چکردھر کو ان سے اتنی بے اعتنائی کی امید نہ تھی۔ اس کا بہت ملال ہوا

دشاسمیدھ گھاٹ پر وہ تانگے سے اُترے۔ اسی گھاٹ پر وہ پہلے بھی اشنان کیا کرتے تھے۔ سبھی پنڈے انہیں جانتے تھے۔ پر آج کسی نے بھی خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم نہ کیا۔ کسی نے نہ پوچھا۔ کہاں کہاں کی سیر کی، اتنے دن کیا کرتے رہے؟

وہ پھر تانگے پر آ بیٹھے اور راجہ صاحب کے محل کی طرف چلے۔ جوں جوں محل قریب آتا تھا۔ اُن کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ تانگہ صدر دروازہ پر پہونچا۔ وہ ریاست کا جھنڈا جو سر اونچا کئے لہراتا تھا جھکا ہوا تھا۔

تانگہ دیکھتے ہی بوڑھا دربان آکر کھڑا ہوگیا۔ چکردھر کو غور سے دیکھ کر اندر کی طرف دوڑا۔ ایک لمحہ میں محل میں کہرام مچ گیا۔

کس سے پوچھیں کیا قیامت برپا ہوئی ہے۔ کوئی قریب نہیں آتا۔ سب کے سب دور سر جھکائے کھڑے ہیں۔ وہ کون لاٹھی ٹیکتا چلا آتا ہے! ارے! یہ تو منشی بجر دھر ہیں۔ چکردھر تانگے سے اتر کر ان کے قدموں پہ گر پڑے۔

منشی جی نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ دو چار دن پہلے نہ آتے بنا کہ لڑکے کا منہ دیکھ لیتے۔ اب آئے ہو جب ستیاناس ہوگیا۔ کیا بیٹھے بیٹھے یہی منا رہے تھے۔

چکردھر روتے نہیں مستقل انداز سے بولے۔ ایشور کی مرضی میں کسی کو کیا دخل۔ مجھے کسی نے ایک خط بھی تو نہ لکھا۔ بیماری کیا تھی۔

منشی۔ بیماری کیا تھی۔ دو سر میں درد تک نہ ہوا۔ بس ہونہار! الغدیر رات

کو کھانا کھا کر بیٹھے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ بہو جی سے باتیں کرتے کرتے جنت کی راہ لی۔ جو سنتا ہے دانتوں انگلی دبا کر رہ جاتا ہے بچارے راجہ صاحب بھی اسی غم میں چل بسے۔ تم نے لڑکے کو بھلا دیا، پر اُسے مرتے دم تک تمہارے نام کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ بچارے کے دل میں کیسے کیسے ارمان تھے۔ ہم اور تم کیا روئیں گے، رو تی ہے رعیت کتنے ہی دنوں میں ساری ریاست اسپر جان دینے لگی تھی۔ اس دُنیا میں کوئی کیا ہے۔ جی سیر ہو گیا اب تو جب تک جینا ہے، تب تک رونا ہے۔ ایشور بڑا ظالم ہے۔

چکر دھر نے لمبی سانس کھینچکر کہا۔ یہ میرے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ایشور کو الزام نہ دیجئے۔

منشی۔ تو تم نے ایسے اعمال کئے ہونگے۔ میں نے نہیں کئے۔ مجھے کیوں اتنی بڑی چوٹ لگائی۔ میں بھی اب تک ایشور کو منصف اور رحیم سمجھتا تھا لیکن اب وہ اعتقاد نہیں رہا۔ بھجن کرتے ساری عمر ختم ہو گئی۔ اُس کا یہ حاصل۔ ہاسپر کہتے ہو ایشور کو الزام نہ دیجئے۔ اپنی بہتری ہی کے لئے تو آدمی بھجن کرتا ہے، یا کسی کی زبان کھجلاتی ہے۔ قسم لے لو جو آج سے کبھی ایک پد بھی گاؤں۔ توڑ ڈالا ستار، سارنگی، سرود، پکھاوج چُور چُور کر ڈالے۔ ایسے ظالم کے گن کون گاسے۔ اور کیوں گاسے۔ بھلے آدمی، کھڑے تاک رہے ہو تمہاری آنکھوں سے آنسو کیوں نہیں نکلتے۔ میں کہتا ہوں رو لو۔ نہیں کلیجہ میں ناسور پڑ جائے گا۔ بڑے بڑے تباہی دیکھے ہیں، لیکن جو پیٹ بھر کر رویا نہیں اُسے پھر ہنستے نہیں دیکھا۔ آؤ اندر چلو۔ بہو نے دیوار سے سر ٹپک دیا۔ پٹی باندھے پڑی ہوئی ہے۔ تمہیں دیکھ کر شاید اُسے کچھ تسکین ہو۔

یہ کہتے ہوئے منشی جی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور محل میں لے گئے۔ اہلیا کو اُن کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ اُٹھنا چاہتی تھی، پر اُٹھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

چکر دھر نے سامنے آ کر کہا۔ اہلیا!

اہلیا نے لیٹے لیٹے شوہر کی جانب دیکھا، کتنی حسرت تھی، کتنا شکوہ، کتنی یاس اور کتنی ندامت۔ چکر دھر رو پڑے۔ اہلیا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر انہیں نمسکار کیا۔ اور پھر آنکھیں بند ہو گئیں۔

اسی وقت منورما آ گئی۔ اہلیا کی طرف دیکھ کر بولی بس آپ ہی کا انتظار تھا۔ جان تو کب کی نکل چکی تھی۔ ہائے! دُکھیا کی کوئی آرزو نہ پوری ہوئی۔

تتمہ

کئی سال گذر گئے ہیں منشی چکر دھر اب قید حیات میں نہیں رہے گھوڑے کی سواری کا اُنہیں بے حد شوق تھا۔ نر گھوڑے ہی پر سوار ہوتے تھے۔ بگھی، موٹر، پالکی کو وہ زنانہ سواری کہتے تھے۔ ایک دن جگدیش پور سے بہت رات گئے لوٹ رہے تھے۔ راستہ میں ایک نالا پڑتا تھا۔ نالے میں اُترنے کے لئے راستہ بھی بنا ہوا تھا۔ لیکن منشی جی نالے میں اُتر کر اسے پار کرنا شان جوانمردی کے خلاف سمجھتے تھے۔ گھوڑے کو جست کرا دیا۔ گھوڑے نے جست ماری۔ اُس پار نکل گیا۔ پر اُس کے پاؤں ایک گڑھے میں جا پڑے منشی جی بھی گرے اور پھر نہ اُٹھے۔ ہنس کھیل کر زندگی کاٹ دی۔ نرملا بھی اِس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکی۔ اُس کی آخری آرزو کہ چکر دھر پھر شادی کر لیں

ناتمام رہ گئی۔

رانی کملا پھر جگدیش پور میں راج کر رہی ہے۔ عیش پسند دیوپریا اب عبادت گذار دیوپریا ہے۔ اس کا مستقبل اب تاریکی میں مستور نہیں ہے۔ نورِ سحر کی پُرامید سُرخی اس کی منزلِ حیات کو روشن کر رہی ہے۔

رانی منورما اب نئے محل میں رہتی ہیں۔ انہوں نے کتنی ہی چڑیاں پال رکھی ہیں۔ اُنہیں کی نگرانی اور پرورش میں اب وہ زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں طیور کے نغموں میں اپنے خلش سے باطن کو دبا دینا چاہتی ہیں۔ اس کی آرام گاہ میں سونے کے چوکٹوں میں جڑی ہوئی ایک لوح دیوار سے لٹکی ہوئی ہے جس پر دیوان ہری سیوک سنگھ کے آخری الفاظ منقوش ہیں۔

لونگی کو دیکھو!

چکردھر بہت دنوں گھر پر نہ رہے۔ ماں باپ کی وفات کے بعد وہ گھر گھر ہی نہ رہا۔ پھر دلن کی راہ لی! لیکن اب وہ صرف عوام کی خدمت نہیں کرتے اُنہیں طیور سے خاص شفقت ہو گیا ہے۔ عجیب و غریب طائروں کی اُنہیں ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ ان کی چڑیوں کا ایک چڑیا گھر ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتا ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ منورما باغ میں ٹہل رہی تھی۔ دفعتاً حوض کے پاس ایک خوبصورت پنجرا نظر آیا۔ اس میں ایک پہاڑی مینا بیٹھی ہوئی تھی۔ منورما کو تعجب ہوا۔ یہ پنجرا یہاں کیسے آیا۔؟ ایسی خوبصورت چڑیا اس کے پاس ایک بھی نہ تھی۔ وہ قریب گئی۔ تو مینا بولی۔

منورا! ہمیں بھول گئیں۔؟ تمہارا پُرانا خادم ہوں۔

منورما کے استعجاب کی انتہا نہ رہی۔ اُسے کچھ خوف ہوا۔ اِسے میرا نام کس نے پڑھایا؟ کس کی چڑیا ہے؟ یہاں کیسے آئی؟ اِس کا آقا ضرور یہیں کہیں ہوگا۔ آتا ہوگا۔ دیکھوں کون ہے؟

وہ بڑی دیر تک کھڑی اس آدمی کا اِنتظار کرتی رہی۔ جب کوئی نہ آیا۔ تو اس نے باغبان کو بُلا کر پوچھا۔ یہ پنجرا باغ میں کون لایا؟ مالی نے کہا۔ پہچانتا تو نہیں سرکار۔ پر ہیں کوئی بھلے مانس۔ مجھ سے دیر تک ریاست کی باتیں پُوچھتے رہے۔

'آج پھر آویں گے'

'ہاں سرکار۔ کہہ تو گئے ہیں'

'آئیں تو مجھے خبر دینا'

'بہت اچھا سرکار'

'صورت کیسی ہے؟ بتا سکتا ہے'

'لمبا قد ہے۔ سانولا رنگ۔ لمبا منہ۔ دُبلے دُبلے سے ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی ہیں'

منورما نے اِشتیاق سے کہا۔ 'مجھے ضرور بلا لینا۔ جانے نہ دینا' سمجھا۔ وہ پنجرا لے کر چلی گئی۔ رات بھر وہی مینا اس کی آنکھوں میں پھرتی رہی۔ وہی جملہ کانوں میں گونجتا رہا۔

صبح وہ اٹھ کر باغ میں آئی۔ شاید وہ آئے ہونگے؟ مگر مالی ابھی تک سوتا تھا۔ وہ آدمی کون ہے۔ یہ اب منورما سے پوشیدہ نہ تھا۔

ہر آدھ گھنٹے میں رانی کی لونڈی مالی کے پاس آکر پُوچھتی تھی 'وہ آئے' ہر بار جواب ملتا 'ابھی نہیں'

سہ پہر کو منورما سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ اپنے بالا خانہ پر جا کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔ وہاں سے مالی کا مکان اور باغ صاف نظر آتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے بڑی دیر ہو گئی۔ اندھیرا ہونے لگا۔ رانی نے ٹھنڈی سانس لی۔ شاید اب نہ آویں گے۔

یکایک اُس نے دیکھا ایک آدمی دو پنجرے دونوں ہاتھوں میں لٹکائے باغ میں آیا۔ منورما کا سینہ بانسوں اُچھلنے لگا۔ ہزاروں گھوڑوں کی طاقت والا انجن اُسے اس آدمی کی طرف کھینچتا ہوا معلوم ہوا۔ پر دونوں ہاتھوں [illegible] تھامے، سانس بند کیے، وہ کھڑی رہی۔ مالی ابھی اُسے بلانے آتا ہوگا۔ مگر مالی نہ آیا۔ اور وہ آدمی وہیں پنجرا رکھ کر چلا گیا۔ منورما اب وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔ ہائے! وہ چلے جاتے ہیں!! اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

مالی نے آکر کہا۔ سرکار وہی آدمی دو پنجرے رکھ گیا ہے اور کہہ گیا ہے پھر کبھی اور چڑیاں لاؤں گا۔

منورما نے غضبناک ہو کر پوچھا۔ تو نے اُسی وقت مجھے کیوں اطلاع نہیں دی؟

مالی پنجرے کو زمین پر رکھتے ہوئے بولا۔ سرکار میں تو ہی آرہا تھا۔ پر اُسی آدمی نے منع کیا۔ کہنے لگا۔ ابھی اُنہیں کیوں بلاؤ گے۔ میں پھر کبھی آکر اُن سے ملوں گا۔

رانی کچھ نہ بولی۔ پنجرے کی دونوں چڑیوں کو پر اشک آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

خاتمہ

(لاہور میں باہتمام مسٹر سوم پرکاش پرنٹر و پبلشر چھپی)

نوٹ:۔ جو حضرات اپنی طلب کردہ اشیاء کا وی پی اندر دن میعاد وصول نہیں کرینگے وہ کمپنی کے نقصانات کے قانوناً و اخلاقاً ذمہ وار ہونگے۔ ڈالی

From Lajpat Rai and Sons Bookseller and Publishers L

لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور

Book Post V.P.P. for Rs. ________ As. ________

To

سیوامیں

نمبر ______

تفصیل اشیاء مرسلہ قیمت طلب تفصیل مطالبہ

روپیہ	آنہ	پائی	تعداد	نام
۸	۱۲	۱۱	۲	[illegible]
				محصول ڈاک
				پیکنگ وغیرہ